پروفیسر خالد شبیر احمد

آتا ہے بہت محرم اسرار وفا یاد

حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو ہم سے رخصت ہوئے قریباً چونتیس برس ہوچکے ہیں۔ اس عرصے میں ایک لمحہ بھی شاید ایسا نہیں آیا جس لمحے ان کی شخصیت کی گرفت ڈھیلی پڑی ہو یا ان کی شخصیت کا سحر کم ہوا ہو، یا پھر وہ یاد نہ آئے ہوں۔ اس بات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کی شخصیت کتنی عظیم، کتنی پُر اثر اور کتنی پُر کشش تھی۔ گزرنے والا ہر لمحہ ہمیں ان کے زیادہ قریب کرتا جا رہا ہے۔ قحط الرجال کے اس دور میں جب ہم اپنے چاروں طرف ایسی کوئی دوسری شخصیت نہیں پاتے جو اُتنی اہم، اتنی پر کشش، اور پروقار ہو یا کم از کم ان کے قریب تر ہو، تو پھر وہ اور زیادہ یاد آتے ہیں اور دل و دماغ کو تڑپا جاتے ہیں۔ غرضیکہ ان کی جدائی میں گزرتے ہوئے یہ ماہ و سال ہمیں بجائے ان سے دور لے جانے کے اور نزدیک لے آئے ہیں۔

یوں دل نشیں ہوا ہے وہ روشن ضمیر شخص
جاتا نہیں ہے دل سے روایات کی طرح

حضرت امیر شریعت سے میرا تعلق خاطر میری زندگی کا وہ سرمایہ ہے جس پر مجھے بجا طور پر فخر ہے۔ انہیں محض دیکھا ہی نہیں ہے بلکہ انہیں قریب ہو کر جانچا اور پرکھا بھی ہے۔ وہ ہر لحاظ سے ایک بلند شخصیت تھے۔ جنہیں انسانوں سے بے پناہ محبت تھی۔ کسی کا دل توڑنا ان کے مسلک میں نہیں تھا۔ ہر قریب آنے والا یہی سمجھتا تھا کہ جتنا شاہ جی اسے چاہتے ہیں اور کسی کو نہیں چاہتے اور جتنا اس کے قریب ہیں اور کسی کے قریب نہیں۔ جس فرد نے، نہیں جتنا قریب سے دیکھا وہ ان سے اتنا ہی متاثر ہوا۔ پھر یہ تاثر عارضی نہیں بلکہ مستقل ہوتا ہے۔ یہ ان کے خلوص ہی کا تو ثبوت ہے کہ آج جب ان کے جاننے والا اور ان کے پاس بیٹھنے والا فرد جب ان کی بات کرتا ہے یا انہیں یاد کرتا ہے تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہونے لگتی ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے ہم نے انہیں کیوں اتنی شدت سے چاہا کہ آج ان کی فرقت میں تڑپ تڑپ جاتے ہیں اور بے اختیار لبوں پہ یہ اشعار رواں ہو جاتے ہیں۔

کہاں گئے وہ جنوں آشنا وہ دیوانے
بڑے اداس ہیں یارو خرد کے ویرانے
عجب سزا ہے تیری مختصر رفاقت کی
بھرے جہاں میں اکیلے ہیں تیرے دیوانے

حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کو جب میں نے پہلی دفعہ چنیوٹ میں دیکھا تو محض چھے سات برس کا بچہ تھا۔ الٰہی بخش شہید (تحریک کشمیر ۱۹۳۱ء) کے بیٹے خالد (جوان کی شہادت کے بعد پیدا ہوئے تھے) میرے ساتھ تھے ہم دونوں احرار یونیفارم میں ملبوس تھے۔ مجھے یاد ہے شاہ جی نے ہمیں بہت پیار کیا تھا اور ڈھیروں دعائیں دی تھیں۔ وہ اس وقت الٰہی بخش شہید جو احرار کی تحریک کشمیر ۱۹۳۱ء کے پہلے شہید تھے۔ کا ذکر کر کے ان کی جرأت اور بہادری کو اپنے معیار کے الفاظ میں خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔ اور ہم ان کے منہ کی طرف ٹک ٹک دیکھ رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک ماہتاب مجسم انسان کی شکل اختیار کر کے آسمان سے زمین پر اتر آیا ہے۔ شاید چاند میں وہ رعنائی نہ ہو جو اس متکلم چاند میں موجود تھی۔ آپ سے اس پہلی ملاقات کا اثر آج تک میرے وجدان اور میرے دل و دماغ کی گہرائیوں میں موجود ہے۔ وہ کیفیت وہ سرور شاید میں اپنے الفاظ میں بیان نہ کر سکوں جو میں محسوس کرتا ہوں۔ شاید کیفیت نام ہی ایسی شے کا ہے جو الفاظ کے نرغے سے ماوراء ہو۔

آپ سے دوسری ملاقات بھی تقسیم ملک سے پہلے چنیوٹ ہی میں ہوئی تھی جب ۱۹۴۶ء کا انتخابی یُدھ اپنے عروج پر تھا۔ وہ چنیوٹ تشریف لائے تو مجلس احرار اسلام کا ایک جلسۂ عام شاہی مسجد کے عقب میں غلہ منڈی میں تھا۔ خان مظہر نواز درانی کو آپ ملتان سے اپنے ساتھ لائے تھے وہ سٹیج پر آپ کے ہمراہ تشریف فرما تھے مظہر نواز درانی احرار کے ٹکٹ پر انتخاب لڑ رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ شاہ جی کی تقریر سے پہلے خواجہ عبدالرحیم عاجز مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں پنجابی کی نظم پڑھی تھی۔

"لڑناں لڑناں احرار نے ہن الیکشن والا جنگ"

بے پناہ مجمع تھا لیکن اتنی ہی خاموشی بھی۔ سب کی نظریں امیر شریعت پر لگی ہوئی تھیں۔ آپ نے اپنی باری پر حسب معمول آخری تقریر فرمائی اور لوگ عش عش کر اٹھے۔ یہ تقریر بھی اگرچہ ایک انتخابی تقریر تھی لیکن آپ نے انتخابی سیاست پر بہت کم تبصرہ کیا تھا اور انگریز کے ذلہ خواروں کو زیادہ تنقید کا نشانہ بنایا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میرے دل میں انگریز دشمنی کا پودا کاشت ہوا اور آج خدا کے فضل و کرم سے جب میں بوڑھا ہو رہا ہوں یہ پودا تناور درخت بن چکا ہے۔ ساری عمر جو کچھ پڑھا اور جو کچھ بھی میرے مشاہدہ اور تجربہ میں آیا وہ سب کچھ اس بات کی تائید میں ہے کہ "اس دھرتی پر ملت اسلامیہ اور امت محمدیہ ﷺ کا سب سے بڑا دشمن انگریز ہی ہے۔ جس سے خیر کی توقع کا تصور بھی گناہِ عظیم ہے۔ جو کچھ آپ نے اس وقت کہا، وقت کے ساتھ ساتھ درست ثابت ہوا۔

ہے حقیقت بس وہی جو تو نے کر دی تھی عیاں
اور سب کچھ وقت کی آنکھوں میں تھا مثلِ سراب
تجھ پہ جو الزام تھا رد ہو گیا ہے وقت سے
تیرے نکتہ چیں ہوئے ہیں شرم سے اب آب آب

اس دفعہ بھی حضرت شاہ جی کا قیام اسلامیہ ہائی سکول چنیوٹ میں ہی تھا۔ جہاں پر ہر وقت لوگوں کا ایک جمِ غفیر موجود رہتا تھا۔ کچھ لوگ اگر آپ کی محفل سے چلے جاتے تو کچھ آ بھی جاتے تھے۔ اسی طرح حضرت شاہ جی کی محفل ہر وقت اپنے عروج پر رہتی تھی۔ میں بھی اس محفل میں اکثر موجود رہتا اور اپنی بساط کے مطابق آپ کی باتوں سے مستفیض ہوا کرتا تھا۔ نہ جانے وہ کیا جاذبیت تھی جو مجھ جیسے نا سمجھ کو بھی ان کی محفل سے اٹھنے نہیں دیتی تھی۔ ان کی گفتگو میں بلا کی چاشنی تھی۔ لوگ ان باتوں پر اکثر سر دھنتے تھے۔ محفل میں بھی بعض اوقات کیا اکثر اوقات تقریر جیسی کیفیت پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ شاہ جی کبھی سنجیدہ موضوع پر گفتگو کرتے تو لوگوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جایا کرتی اور جب کبھی ہنسنے ہنسانے پر آجاتے تو ارد گرد بیٹھنے والے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ کی محفل میں آنجہانی سر سکندر حیات وزیر اعلیٰ پنجاب کا ذکر بھی آیا۔ مجھے اب تک یاد ہے شاہ جی فرما رہے تھے۔

میں نے زندگی بھر کسی کے لئے بد دعا نہیں کی۔ میری عادت ہے کہ لوگوں کے قصور معاف کر دیا کرتا ہوں۔ میری فطرت کے ہی خلاف ہے کہ میں ذاتی انتقام کے بارے میں سوچوں۔ میری کوئی ذاتی دوستی یا ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ میری دوستی بھی خدا کے لئے ہے اور میری دشمنی بھی خدا کی رضا کے لئے ہی ہے لیکن اگر میں نے زندگی میں کسی کے لئے بد دعاء کی ہے تو وہ سکندر حیات" اور اس جیسے دو تین آدمیوں کے لئے جس نے انتہائی سازشی انداز میں میرے خلاف سراسر جھوٹا بغاوت کا مقدمہ دائر کرا کر مجھے پھانسی دلوانے کی ناکام کوشش کی۔"

یہ بات سکندر حیات کی زندگی کی ہے۔ اس کی موت اس واقعہ کے بعد ہوئی اور آج تک جو کچھ اس خاندان سے ہو رہا ہے۔ آپ کے سامنے ہے۔

شاہ جی جب بھی چنیوٹ تشریف لاتے تھے مجھے اطلاع ہو جایا کرتی تھی۔ کیونکہ ان کی قیام گاہ اور جلسہ گاہ میرے گھر کے قریب ہی واقع تھی۔ پھر شاہی بازار کے احرار رضا کاروں کے ساتھ میرا رابطہ ہوتا تھا۔ جن کے ذریعہ سے شاہ جی کے آنے کے پروگرام کا مجھے پہلے سے ہی علم ہو جاتا۔ شاہ جی جب بھی چنیوٹ تشریف لاتے تو آپ کی دو فرمائشیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک سعید کے چھوچنے دوسرے بخش الٰہی کو کہیں سے لاؤ۔ سعید ہمارے شہر میں چنے بنایا کرتا تھا۔ مسلم بازار میں اسکی دکان تھی۔ یہ چنے اتنے مزے دار ہوتے کہ جو کھاتا بس ہونٹ چاٹتا رہ جاتا۔ شاہ جی کو یہ چنے بڑے ہی مرغوب تھے۔ چونکہ میں عمر میں چھوٹا تھا بڑے احرار رضا کار ان فرمائشوں کے لئے مجھے ہی دوڑایا کرتے تھے۔

"بخش الٰہی" ہمارے شہر کے ایک مشہور مجذوب تھے۔ چنیوٹ کی شیخ برادری سے ان کا تعلق تھا۔ بخش الٰہی اپنی حالت میں مست گلیوں اور بازاروں میں اکثر گھومتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی لوگ بخش الٰہی کو تقریر کے لئے کہتے تو وہ کسی اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر تقریر کرتا۔ تقریر میں مسلمانوں کو ان کی غیرت و حمیت کا

احساس دلاتا اور بے پردہ خواتین کی مذمت کیا کرتا۔ اکثر اوقات یہ تقریر مرزائیوں کے خلاف ہوتی۔ لوگ اس پر اسے داد دیتے اور وہ داد وصول پا کر خوشی کا اظہار کرتا۔ کبھی کبھی یہ تقریر وہ اپنے گھر کی چھت پر کھڑے ہو کر بھی کیا کرتا تھا۔ جب وہ مرزائیوں کے خلاف تقریر کرتا تو مغلظات بھی بک دیا کرتا تھا۔ لوگ اس کے ارد گرد جمع ہو کر اس کی ان تقریروں کو بڑے غور اور دلچسپی سے سنتے تھے اور کہتے تھے کہ مجذوب لیکن بات درست کرتا ہے۔ حضرت شاہ جی جب بھی چنیوٹ تشریف لاتے بخش الٰہی سے ضرور ملاقات کرتے تھے۔ نہادھو کر جب اپنی قیام گاہ پر تشریف فرما ہوتے تو بخش الٰہی کو تلاش کرنے کو کہتے کہ اسے بلاؤ مجھے اس سے ملنا ہے۔ یہ فریضہ بھی عموماً مجھے ہی ادا کرنا ہوتا تھا۔ یہ عجیب اتفاق ہے جب میں تلاش کرنے کے لئے نکلتا تو سوچتا کہ ایک مجذوب آدمی جس کا کوئی ٹھکانا ہے نہ کوئی پتا؟ گھر پر وہ بیٹھتا نہیں اسے کیسے تلاش کروں گا، وہ نہ جانے کہاں ہو گا؟ میں ہر مرتبہ اسے ایک مشکل کام تصور کرتا۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ جب بھی میں ایسا سوچتا وہ مجھے کہیں نزدیک سے ہی مل جایا کرتا تھا۔ میں خوشی سے اچھل کر اسے کہتا "او بخش الٰہی! عطاء اللہ شاہ بخاری آئے ہوئے ہیں تجھے بلاتے ہیں چلو؟" وہ عجیب انداز میں میری طرف دیکھتا اور پھر ہنس کر کہتا۔

"ہاں ہاں چلو چلو، بخارا، بخارا یار ہے یار ہے۔ بخاری کی بجائے وہ ہمیشہ شاہ جی کو بخارا کہتا تھا۔ میں نے کبھی اس کے منہ سے بخاری نہیں سنا۔ میں اسے لیکر شاہ جی کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ شاہ جی جب اسے دیکھتے تو اٹھ کر کھڑے ہو جایا کرتے تھے اور اسے بغل گیر ہو کر بڑے اہتمام کے ساتھ ملتے تھے۔ بڑے انہماک کے ساتھ اس سے گفتگو فرماتے تھے۔ بعض اوقات یہ گفتگو خاصی طویل بھی ہو جایا کرتی تھی لیکن کیا مجال کہ پاس بیٹھے ہوئے ذرہ بھی بور ہوں۔ بڑی ہی دلچسپ باتیں ہوا کرتی تھیں۔ بخش الٰہی شاہ جی کی ہر تقریر میں موجود ہوتا تھا۔ وہ بڑے غور سے آپ کی تقریر کو سنتا تھا۔ لوگ اس بات پر بھی حیران ہوتے کہ ایک مجذوب آدمی جس کو کسی لمحے چین نہیں۔ کئی گھنٹوں تک مسلسل ایک جگہ بیٹھ کر شاہ جی کی تقریر کیسے سن لیتا ہے؟

مجھے یاد ہے کہ ایک بار شاہ جی نے "ماڈرن انڈس" ٹرین سے چنیوٹ پہنچنا تھا۔ جو رات کو تقریباً ایک بجے سٹیشن پر آتی تھی۔ میں اگرچہ بچہ تھا تاہم ضد کر کے اپنے بڑے رضا کاروں کے ہمراہ اسٹیشن پر استقبال کے لئے موجود تھا۔ میں حیران ہو گیا جب میری نگاہ بخش الٰہی پر پڑی جو ہم سے پہلے رات کو ایک بجے سٹیشن پر موجود تھا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "بخش الٰہی" شاہ جی آ رہے ہیں۔ کہنے لگا۔ "ہاں ہاں بخارا بخارا اپنا یار ہے۔ یار ہے آ رہا ہے۔" راہ چلتے ہوئے جب بھی لوگ سید عطاء اللہ شاہ بخاری "کا نعرہ لگاتے تو وہ جواب میں زور سے زندہ باد کا نعرہ بلند کرتا اس کی آواز سے ایک گونج سی پیدا ہوتی تھی۔ ان دونوں (امیر شریعت اور بخش الٰہی مجذوب) کے درمیان جو وجدانی اور روحانی تعلق تھا کسی کو معلوم نہیں۔

چنیوٹ میں شاہ جی کے سب سے قابل اعتماد ساتھی، ملک اللہ دتہ مرحوم تھے۔ جو بڑی مدت تک مجلس احرار اسلام کے مقامی صدر بھی رہے۔ بلوچ خاندان سے آپ کا تعلق تھا۔ انتہائی زیرک اور بہادر انسان تھے۔

اپنے وقت کی پوری سیاسی تاریخ ان کے دماغ میں محفوظ تھی۔ کوئی اہم سیاسی واقعہ ایسا نہیں تھا جو ملک اللہ دتہ مرحوم کی یاد سے باہر ہوتا۔ حضرت شاہ جی کے شیدائی تھے۔ ملک کی آزادی تک شادی نہ کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ چنانچہ آپ کی شادی ۱۹۴۸ء میں ہوئی۔ ملک رب نواز ایڈووکیٹ ان کے فرزند ہیں جو ۱۹۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ملک اللہ دتہ تحریک تحفظ ختم نبوت میں قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے۔ ملک صاحب کے علاوہ سالار "نذر محمد" "شیر محمد آزاد" "ظہور احمد" "شیر محمد وسیر" "نذر محمد کیتھ" محمد حسین ہمارے بازار کے نڈر احرار رضا کار تھے۔ جو سارے شہر میں جماعتی کام کے لئے مشہور و معروف تھے۔

ایک دفعہ شاہ جی چنیوٹ تشریف لائے تو ملک اللہ دتہ صاحب کے گھر پر ہی مقیم ہوئے۔ دوران قیام شاہ جی نے ملک صاحب کو کہا کہ کوئی دلچسپ بات سناؤ؟" ملک صاحب نے انہیں اپنے بزرگ کا واقعہ سنایا کہ جب فیصل آباد (لائل پور) نیا نیا بنا تھا تو وہ اپنے ایک کم عمر بیٹے کو لیکر شہر چلا گیا۔ کہ نیا شہر دکھائے شہر میں گھومتے پھرتے بچہ باپ سے الگ ہو گیا۔ باپ نے اپنے بچے کو انتہائی پریشانی کی حالت میں تلاش کرنا شروع کر دیا۔ لیکن بچہ نہ ملا۔ اب یہ بھی اتفاق ہے کہ جب بھی وہ بزرگ کسی سمت سے گھوم گھام کر آتا تو سامنے اس کے فیصل آباد کا گھنٹہ گھر آجاتا تھا۔ ایک طرف بچے کی گمشدگی کی پریشانی اور دوسری جانب سے یہ صورت حال کہ گھنٹہ گھر ہر بار سامنے آجاتا۔ اسے مزید پریشان کر رہا تھا۔ بالاخر وہ گھنٹہ گھر کے سامنے کھڑے ہو کر غصہ میں بولا۔ اے گھنٹہ گھر میرے بچے کو تو نے ہی گم کیا ہے۔ اسے تو نے ہی کہیں چھپا رکھا ہے۔ جب بھی میں اسے تلاش کرنے لگتا ہوں تو تو میرے سامنے آجاتا ہے۔ اور میرے راستے کی رکاوٹ بن جاتا ہے؟" بس ملک صاحب نے یہ واقعہ کیا سنایا کہ شاہ جی مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئے اور دیر تک اس لطیفہ سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ رات کو جلسہ گاہ پہنچے تو اپنی پوری تقریر کو اس واقعے کے تناظر میں بیان کر دیا، پہلے جلسہ میں یہ واقعہ سنایا اور پھر انگریزی سامراج کو لائل پور کے گھنٹہ گھر سے تشبیہ دی اور بچے کو عظمت رفتہ کے ساتھ اور مسلمانوں کو باپ کے ساتھ تشبیہ دیکر بات بنالی کہ

"ہم ایک مدت سے اسلام کی عظمت رفتہ کی تلاش میں سرگرداں ہیں لیکن اس راستے کی عظیم رکاوٹ برطانوی سامراج ہے جو ہمارے راستے کو روکے کھڑا ہے۔ ہماری ہر ترکیب، ہماری ہر کوشش، ہماری ہر کاوش اس سامراج کی وجہ سے بہ ظاہر ناکام ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر ہمیں عظمت رفتہ کو دوبارہ حاصل کرنا ہے تو پھر اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ ہم اپنے پورے وسائل کے ساتھ برطانوی سامراج کے ساتھ ٹکرا جائیں۔ اس کی طاقت کو پاش پاش کر کے رکھ دیں جس کے بعد ہمارا راستہ صاف ہو جائے گا۔ اور ہمارا اپنی منزل مقصود پہنچنا آسان اور سہل ہو جائے گا۔"

۱۹۴۵ء کا اواخر تھا یا پھر غالباً ۱۹۴۶ء کا آغاز کہ ہم لوگ چنیوٹ سے دہلی نقل مکانی کر گئے۔ قبلہ والد ماجد محترم نذیر احمد مجیدی مرحوم وہاں پر کاروبار تھا۔ انہوں نے ہمیں بھی وہیں بلوالیا۔ ہم لوگ "چاندنی چوک" اور

"بلی ماراں" کے سنگم پر ایک مکان پر مقیم ہوئے۔ جہاں سے فتح پوری مسجد چند قدم کے فاصلہ پر تھی۔ فتح پوری مسجد کے اوپر "فتح پوری مسلم ہائی سکول میں مجھے ساتویں جماعت میں داخلہ ملا۔ ان دنوں مجھ پر مجلس احرار اسلام کا جنون پورے جوبن سے طاری تھا۔ یہ پورا علاقہ مسلم لیگ کا گڑھ شمار ہوتا تھا۔ فتح پوری مسجد میں جمعہ کے روز مسلم لیگ کا پرچم لہرایا کرتا تھا۔ جبکہ جامع مسجد دہلی میں مجلس احرار اسلام کا سرخ ہلالی پرچم لہرایا کرتا۔ فتح پوری مسلم سکول میں بھی مسلم لیگ ہی چھائی ہوئی تھی۔ لڑکوں کی اکثریت بھی مسلم لیگی ہی تھی۔ میں نے بھی باوجود اس صورت حالات سے واقفیت کے پہلے دن جب سرخ قمیض پہن کر سکول جانے کا قصد کیا تو قبلہ والد صاحب نے مجھے ٹوکا اور کہا کہ "وہاں سکول میں سب لڑکے لیگی ہونگے۔ اور وہ پھر تجھے تنگ کریں گے"۔ لیکن میں نے ان کی ہدایت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ پہلے دن تو ہر لڑکے نے مجھے روک کر میری سرخ قمیض کی طرف اشارہ کر کے پوچھا "ابے تو احراری ہے کیا؟" میں نے سینہ چوڑا کر کے ہر ایک کو جواب میں کہا ہاں میں حراری ہوں دوسرے دن چھٹی کے بعد لڑکوں نے اکٹھے ہو کر مجھے گھیرا اور باقاعدہ پٹائی کی۔ میں اکیلا اور وہ بے شمار، اب ہر روز یہ ان کا معمول ہو چکا تھا۔ تعداد میں کثرت کی وجہ سے پلڑا ہمیشہ ان کا ہی بھاری رہتا تھا اگرچہ میں بھی اپنی ہمت کے مطابق کچھ نہ کچھ تو مدافعت کرتا تھا۔ اب مجھے احساس ہوا کہ والد صاحب نے صحیح کہا تھا۔ اور یہ میری غلطی تھی۔ تاہم اب کیا ہو سکتا تھا ایک دن انہیں باقاعدہ منصوبہ کے تحت جوش دلا کر میں اپنے ہمراہ گھر تک لایا جو سکول سے کچھ زیادہ دور نہ تھا اور اپنے چچا جان کو اوپر سے بلا لایا۔ چچا جان اس وقت ٹھیٹھ پنجابی لباس میں تھے۔ پاؤں میں سلیپر، دھوتی، لمبے بال، سفید دیسی کرتا۔ انہوں نے جو لڑکوں کو للکارا تو لڑکے ڈر کے مارے کتابیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ دوسرے دن لڑکوں کو سکول میں سرگوشیوں کے اندر یہ کہتے ہوئے سنا۔

"اس کے پاس بدمعاش ہے اس کے قریب مت جائیو، نہیں تو قتل کروا دے گا۔ ہم نے خدا کی قسم اپنی آنکھوں سے بدمعاش دیکھا ہے"

دراصل جس لباس میں لڑکوں نے چچا جان کو دیکھا تھا وہ وہاں بدمعاش پہنتے تھے اور دہلی کے لوگ بدمعاشوں سے بہت ڈرتے تھے۔ خدا نے اس طرح میری مدد کی کہ اب اسی سکول میں میرا رعب تھا۔ اور کوئی لڑکا میری ہوا کو بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

دہلی میں جاتے ہی ہم نے اپنے مکان پر مجلس احرار اسلام کا پرچم لگا دیا تھا اور ہر جمعہ کو جامع مسجد میں نماز جمعہ پڑھنے جاتے۔ ہم سارے بھائی پیدل بلی ماراں سے چاوڑی بازار ہوتے ہوئے جامع مسجد پہنچ جایا کرتے تھے۔ جمعہ کے روز جامع مسجد کے محراب کے قریب اور باہر صحن میں مجلس احرار اسلام کے پرچم لہراتے ہوئے نظر آتے تھے جس سے یہ تاثر عام تھا کہ اس علاقہ میں مجلس احرار اسلام کے حامیوں کی اکثریت ہے۔ ویسے بھی احرار کے تمام جلسے بالعموم اسی جامع مسجد میں ہی ہوا کرتے تھے۔ شورش کاشمیری مرحوم کو سب سے پہلے اسی

مسجد میں دیکھا اور سُنا۔ میرے خیال میں وہ فوجی بھرتی بائیکاٹ کی تحریک ۱۹۳۹ء سے سات سال کی قید کاٹ کر جو رہا ہوئے تو سب سے پہلے دہلی تشریف لائے۔ ان دنوں دہلی میں سب احراری اکٹھے ہوئے تھے۔ شورش سے پہلے امیر شریعت نے خطاب فرمایا۔ ملکی سیاست پر احرار کا موقف تفصیل کے ساتھ بیان کیا تھا۔ آپ نے اپنی تقریر کے بعد شورش کو بلایا جو اس وقت مسجد کے ہال میں محراب کے قریب بیٹھے تھے۔ لیکن شورش شاہ جی کے بعد تقریر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے برابر انکار کر رہے تھے۔ بالآخر شاہ جی کے شدید اصرار پر شورش آئے اور انہوں نے شاہ جی کے بعد تقریر کی۔ یہ شورش کی وہ پہلی تقریر تھی جو میں نے سنی۔

پھر جب "آزاد ہند فوج" رہا ہوئی۔ ان سب فوجیوں نے اپنی پھٹی پرانی وردیوں میں ملبوس دہلی کے بازاروں میں مارچ کیا۔ آزادی اور سبھاس چندر بوس کے نعرے لگائے۔ ایک عجیب سماں تھا وہ جدھر سے بھی گزرتے لوگ سراپا عقیدت بن جاتے تھے۔ آزاد ہند فوج کے سپاہی جوش و خروش کی مثال بنے۔ اطمینانِ قلب، اعتماد، عزمِ راسخ کی تصویر، قدم سے قدم ملا کر مارچ کر رہے تھے۔ میں اس فوج کے ساتھ ساتھ تھا۔ وہ جدھر جاتے میں بھی ان کے ساتھ قدم ملاتا نعرے لگاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ نہ جانے وہ کہاں کہاں گئے، لیکن وہ جہاں جہاں بھی گئے میں ان کے ہمراہ تھا۔ دل میں ایک عجیب جذبہ تھا۔ ہائے وہ کیفیت، آج بھی جب اس کیفیت کا احساس کرتا ہوں تو مزاج عجیب رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ اس رنگ میں فقط ایک ہی ترنگ موج زن نظر آتی ہے۔ اور یہ انگریز دشمنی کی ترنگ ہے۔ آزادی وطن کی آرزو، جس کا پودا امیر شریعت نے دل و دماغ میں بچپن ہی میں لگا دیا تھا۔

کیپٹن ڈھلون، کیپٹن سہگل اور کیپٹن شاہنواز کی رہائی کے موقع پر ایک جلسہ عام کانگریس کے زیر اہتمام گاندھی گارڈن میں ہوا تھا۔ یہ بڑا عظیم الشان اجتماع تھا۔ تاحد نگاہ انسان ہی انسان تھے۔ انگریز دشمنی کا اتنا عظیم مظاہرہ میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

مجلس احرار اسلام دہلی نے بھی کیپٹن شاہنواز کو انہی دنوں شاہی مسجد کے سامنے ننگی تلواروں سے سلامی دی حالانکہ احرار رضا کاروں پر پابندی تھی کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ لیکن اس کے باوجود جامع مسجد میں مجلس احرار اسلام کا جلسہ بھی ہوا اور ننگی تلواروں سے سلامی بھی دی گئی۔ جس سے کیپٹن شاہنواز نے خطاب کیا۔ میں اس جلسے میں شریک تھا۔ سٹیج کے بالکل قریب کیپٹن شاہ نواز کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ کیا خوبصورت جوان تھا۔ چہرے کی سرخی میں بلا کی رعنائی تھی۔ قدوقامت دلکش، نگاہ میں عقابی عزائم کی تصویر جھلک رہی تھی۔ انداز تقریر بے خوف اور بے باک تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ تقریر نہیں کر رہا بلکہ میدان جہاد میں کھڑا کوئی بہادر تلوار چلا رہا ہے۔ تقریر کا آغاز ہی اس نے اس شعر سے کیا تھا۔

غازیوں میں بُو رہے گی جب تلک ایمان کی
تیغ لندن تک چلے گی اہل ہندوستان کی

آزاد ہند فوج کے اس نڈر اور بہادر کیپٹن نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہمارے خلاف یہ محض پراپیگنڈا ہے کہ ہم کانگرس کے ایجنٹ ہیں، ایسا نہیں ہے۔ ہم انگریزوں کے خلاف کانگریس کے ساتھ ہیں۔ اگر کبھی حالات کا بہاؤ ہمیں اس مقام پر لے گیا کہ مسلمانوں کے مفاد کے لئے کانگریس سے لڑنا ضروری ہو گیا تو جس دلجمعی کے ساتھ آج ہم انگریزوں کے ساتھ لڑ رہے ہیں اسی دلجمعی کے ساتھ ہم آپ کو کانگریس کے ساتھ بھی لڑتے ہوئے نظر آئیں گے۔ ہم پہلے مسلمان ہیں بعد میں ہندوستانی"

اس جلسے کے بعد احرار رضا کاروں کے خلاف مقدمات بھی بنائے گئے کہ انہوں نے دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کی ہے۔ شاہ نواز کو ننگی تلواروں سے سلامی دی ہے۔ اس کے اعزاز میں جلوس مرتب کیا اور جلسہ منعقد کیا ہے۔ بہر حال یہ کھیل تو احرار رضا کار مدت سے کھیلتے چلے آ رہے تھے۔ ان کے لئے یہ کوئی نیا مشغلہ نہیں تھا۔

جامع مسجد دہلی کے جنوبی دروازے کے سامنے تمام سیاسی جماعتوں کے دفاتر تھے۔ ہر دفتر پر اس جماعت کا پرچم لہراتا تھا۔ ایک عجیب سماں تھا جو دیکھنے کے قابل ہوتا۔ مجلس احرار اسلام کا دفتر بھی یہیں پر تھا۔ ایک دن میں سرخ وردی میں ملبوس دفتر احرار میں اکیلا بیٹھا تھا کہ ضیغم احرار حضرت شیخ حسام الدین رحمتہ اللہ علیہ دفتر میں تشریف لائے۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ شیخ حسام الدین ہیں انہوں نے قریب آ کر السلام علیکم کہا اور خود اپنا تعارف کرایا۔ نہایت دھیمے اور نرم لہجے میں فرمایا "مجھے حسام الدین کہتے ہیں"۔ میں سراپا عقیدت اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تو انہوں نے مجھے بیٹھے رہنے کو کہا۔ میں انہیں اپنے قریب پا کر نہایت خوش تھا کہ وہ بھی ان شخصیتوں میں سے ایک ہیں جن کے زندہ باد کے نعرے عموماً ہم لگایا کرتے تھے۔ یہ ان سے پہلی ملاقات تھی وہ کچھ اس طرح ملے کہ جیسے وہ مجھ سے کم تر شخصیت ہوں۔ ان کی عجز و انکساری سے مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ وہ شاید مجھ سے خوفزدہ ہیں۔ وہ اس طرح آہستہ آہستہ مجھ سے بات کرتے کہ جیسے مجھ سے مرعوب ہوں۔ لیکن بعد میں دہلی میں منعقد ہونے والے جلسوں میں جو انہیں دیکھا اور سنا تو ان کی تقریر کی گھن گرج سے دہلی کے در و دیوار لرزتے ہوئے دکھائی دیئے۔ انگریزی سامراج کے خلاف ایک للکار جو زمین سے آسمان تک کی فضا میں ایک ارتعاش پیدا کر دیتی تھی۔ ایسے میں اکثر یہی سوچتا کہ کیا یہ وہی شخص ہے جو مجھے دفتر احرار میں ملا تھا۔ اپنوں کے لئے نرمی اور کفر کے لئے اس بلا کی سختی تو دفعتاً ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر ذہن میں ابھرتا ہے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

بلی ماراں کے عقب میں مشرق کی جانب ایک بہت ہی مشہور کوچہ "کوچہ رحمان" ہے جس میں ایک بہت ہی بڑے وسیع مکان میں تمام احرار رہنما قیام پذیر تھے۔ یہیں امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی تشریف فرما تھے۔ میں اکثر چھٹی کے بعد گھر پر بستہ رکھ کر چلا آتا یہاں اکابر احرار کی گفتگو سے محظوظ ہوتا اور حضرت امیر شریعت کی محافل کا لطف اٹھایا کرتا۔ شاہ جی اب مجھے میرے نام سے پکارتے۔ شبیر بیٹا کہتے اور بعض اوقات کسی کام کے لئے بھی کہہ دیتے جیسے گھر میں بڑے بچوں کو بازار کے کام کے لئے کہہ دیتے ہیں۔ یہ روز کی ملاقاتیں مجھے ان کے بہت قریب لے آئی تھیں۔ اکثر جب آپ گفتگو سے فارغ ہوتے تو مجھے جسم دبانے کے لئے کہتے۔ میں ان کی دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پکڑ کر ان کی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر انہیں دبایا کرتا تھا۔ اس دوران وہ اپنی ہلکی پھلکی باتوں سے مجھے محظوظ فرمایا کرتے۔ ایک دن لتاڑتے ہوئے اچانک میرا پاؤں ان کے پیٹ پر پڑا تو مسکرا کر فرمانے لگے "یوں نہیں بیٹا! یہ چوری وار کرتے ہو۔ چوری وار کرنا مردوں کا شیوا نہیں ہے۔ مرد تو للکار کر حملہ آور ہوتے ہیں" مجھے فرمانے لگے اب میرے پیٹ پر اپنے دونوں پاؤں رکھو۔ میں نے تعمیل ارشاد میں جب اپنا پاؤں ان کے پیٹ پر رکھا تو آپ نے اپنا پیٹ اس اثنا میں پھلا کر کس لیا تھا جو میرے پاؤں رکھنے کے باوجود مجھ سے نیچے نہ دبایا جا سکا۔ پھر انہوں نے مجھے دوسرا پاؤں بھی اپنے پیٹ پر رکھنے کے لئے کہا میں نے اپنا دوسرا پاؤں بھی ان کے پیٹ پر رکھ دیا۔ حکم ہوا کہ اب میرے پیٹ کو نیچے دباؤ لیکن میرے زور لگانے کے باوجود بھی پیٹ نیچے نہ دبا تو ہنس دیئے اور دیر تک میرے ساتھ باتوں میں مصروف رہے۔ اب میری سمجھ میں آتا ہے یہ سب کچھ وہ میرے لئے کرتے تھے۔ یہ ان کا مزاج تھا کہ وہ اپنے مخاطب کی عمر کے مطابق اس سے ہم کلام ہوتے تھے۔ اسے اس دوران کبھی یہ احساس نہ ہوتا یا پھر وہ کسی کو یہ احساس نہ دلاتے کہ وہ کتنے عظیم انسان ہیں؟ وہ بچوں کے ساتھ بچوں والی حرکتیں کر کے یہ تاثر دیتے کہ گویا وہ بھی ان جیسے بچے ہی ہیں۔ میں نے اکثر و بیشتر ان کی مجالس میں دیکھا کہ جب بھی ان کی محفل میں کوئی بچہ آجاتا تو وہ سب سے توجہ ہٹا کر اس بچے کی طرف متوجہ ہوتے اپنی زبان کو توتلا کر کے اس سے باتیں کرتے۔ وہ خواہ جتنی بھی اہم بات کر رہے ہوتے اسے روک کر آنے والے بچے کے ساتھ باتیں کرتے یہ باتیں بعض اوقات کافی وقت لے لیتی تھیں۔ یہ باتیں ایسی پیاری ہوتی تھیں کہ سننے والا ان باتوں سے کئی سبق حاصل کرتا تھا۔ اور کبھی بور نہ ہوتا تھا۔ کوئی عالم دین تشریف لے آتے تو سید عطاء اللہ شاہ بخاری بطور عالم دین اس کے ساتھ ہمکلام ہوتے تھے۔ اب سیرت، فقہ، حدیث، قرآن، تفسیر موضوع گفتگو بن جاتے امیر شریعت کو کئی مفسرین و مترجمین کے قرآن کے تراجم ازبر تھے۔ وہ ایک آیت کا ترجمہ مختلف مترجمین کے حوالے سے کرتے اور کہتے کہ جو اس مفسر و مترجم حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمے میں بات پائی جاتی ہے وہ کسی دوسرے کے ترجمہ میں نہیں ہے۔ علماء حضرات جو اس دوران آپ سے ہمکلام ہوتے تو متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے۔ اب میں اکثر سوچتا ہوں یہ سب کچھ وہ بیان کرتے جو کہا کرتے تھے

۔ کہ "میں نے تو اپنی کتابوں کی گرد جھاڑ کر بھی نہیں دیکھی۔ جو احترام علماء حضرات کا آپ کرتے تھے وہ فقط آپ کا ہی حصہ ہے۔ آپ کی محافل کا عجیب رنگ ہوتا۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا۔ اسی دوران شاعر اگر آجاتے تو اب سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایک شاعر نظر آتے۔ نظم، غزل، مرثیہ، قطعہ، دوہا، رباعی، نعت، منقبت غرضیکہ شاعری کی وہ کونسی صنف ہے جو زیر بحث نہ آتی۔ اور سننے والے اس سے لطف اندوز نہ ہوتے۔ علم و ادب کا ایک خوبصورت بازار سج جاتا تھا۔ دیکھنے سننے والا حیران و ششدر رہ جاتا کہ امیر شریعت ادب و فلسفہ میں بھی ایسی مہارت تامہ رکھتے ہیں کہ بڑے بڑے ادیب و شاعر آپ کی ہر بات اور آپ کی نکتہ آفرینیوں پر سر دھننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ میں نے انہیں شعراء کا کلام سناتے ہوئے بھی دیکھا اور شعراء کو اپنا کلام سناتے ہوئے بھی دیکھا۔ بڑے بڑے شاعران کے سامنے کلام پڑھتے تو ایک عجیب کیفیت میں محو ہو جاتے۔ امیر شریعت کچھ اس انوکھے انداز سے داد دیتے کہ شاعر تڑپ اٹھتا ایک اچھے شعر کے بارے میں دس پندرہ منٹ تک گفتگو ہوتی رہتی فرماتے کہ یہ شعر آپ کا بہت ہی عمدہ ہے۔ غالباً غالب نے اسی مفہوم کو اس طرح سے ادا کیا ہے لیکن جو بات نظیری کے اس شعر میں ہے وہ کسی میں بھی نہیں ہے۔ فارسی شعراء میں غالب، اقبال کے ساتھ ساتھ حافظ، فردوسی، اور بیدل کے سینکڑوں شعر آپ کو زبانی یاد تھے۔ آپ شعر پڑھتے تو سننے والا حیرت میں ڈوب جاتا کہ یہ وہی شخص ہے جو کچھ تھوڑی دیر پہلے علم فقہ، حدیث اور تفسیر پر علماء کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ فیصل آباد میں مدرسہ اشرف المدارس کے سالانہ جلسہ پر تشریف لائے ہوئے تھے۔ گورونانک پورہ گلی نمبر ۱۱ کے ایک مکان کی بیٹھک میں تشریف فرما تھے۔ حافظ لدھیانوی تشریف لائے تو آپ کے چہرے پر ایک خاص چمک دیکھی۔ چند منٹ تو خیریت معلوم کرنے میں گزر گئے بعد میں آپ نے فرمائش کی کہ حافظ بیٹے کچھ سناؤ" حافظ لدھیانوی انہیں اپنا کلام سناتے رہے اور شاہ جی اپنے انداز میں انہیں داد دیتے رہے۔ اتفاقاً میں اور حافظ لدھیانوی ایک ہی وقت میں ان کی پرلطف محفل سے اٹھ کر باہر آئے تو حافظ لدھیانوی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ کہہ رہے تھے۔

"نہ جانے یہ کیا شخصیت ہے کہ انسان کو مبہوت کر دیتی ہے اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کہاں بیٹھے اور کیا کر رہے ہیں۔ شعر کو سمجھنا اور شعر پر داد دینا کچھ شاہ جی پر ختم ہے۔ یہ انداز بہت ہی عجیب اور انتہائی منفرد ہوتا ہے۔ ایسی کیفیت میں شاعر محو ہو جاتا ہے جس کو الفاظ میں بیان کرنا ہی مشکل ہو جاتا ہے۔"

کوچہ رحمٰن کے اسی مکان جس کا تذکرہ اوپر ہو رہا تھا میں نے امیر شریعت اور علامہ انور صابری مرحوم کو آمنے سامنے بیٹھے فی البدیہہ شعر کہتے بھی دیکھا ہے۔ علامہ انور صابری اپنے سامنے سگریٹوں کا ایک ڈھیر لگائے بیٹھے تھے۔ کاغذ آپ کے سامنے دھرا تھا اور کش پہ کش لگاتے ہوئے شعر پہ شعر لکھتے جا رہے تھے۔ شاہ جی ان کے سامنے بیٹھے ان کے اشعار پر داد دیتے جا رہے تھے۔ باقی سب لوگ یہ نظارہ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ مجھے

اس دن پتہ چلا کہ انور صابری شعر کس طرح کہتے ہیں۔ ان کے دماغ میں گویا کوئی شعر ساز فیکٹری ہے جس میں شعر ڈھل ڈھل کر ان کی زبان پر منتقل ہوتے جارہے ہیں۔ میں ایک بچہ تھا دیکھ کر حیران تھا کہ ایسے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں جو شعر گوئی جیسے مشکل فن پر اتنی قدرت رکھتے ہیں کہ گویا شعر کہنا ان کے لئے کوئی کام ہی نہیں ہے؟

شعر گوئی اور شعر فہمی سے حضرت امیر شریعت کو ایک فطری اور خصوصی لگاؤ تھا۔ غالب اور اقبال از بر تھے۔ تقریر کے دوران شعر پڑھنا کوئی ان سے سیکھے۔ یوں محسوس ہوتا کہ شاعر نے یہ شعر اسی موقع کے لئے لکھا ہے۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ فیصل آباد جو اس وقت لائل پور ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۵۳ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت میں سکھر جیل سے ایک سال قید کے بعد رہا ہو کر آئے تھے تقریر کے دوران سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اس بیان پر تنقید کر رہے تھے جو انہوں نے منیر انکوائری کمیشن کے سامنے دیا تھا جو کچھ اس طرح کا تھا۔

"میں نے تو انہیں (مجلس عمل والوں کو) منع کیا تھا کہ تحریک نہ چلائی جائے لیکن انہوں نے تو میری مانی ہی نہیں۔ میں تحریک چلانے کے خلاف تھا۔ میری مثال تو اس مسافر کی سی ہے جو سڑک کے کنارے چلا جارہا ہو ایک ٹرک پیچھے سے آئے اسے اپنی لپیٹ میں لے کر روندتا ہوا آگے نکل جائے"

شاہ جی نے اپنی تقریر کے دوران مودودی صاحب کے اس بیان پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ جس وقت ہم نے مجلس عمل کے تحت تریک چلانے کا فیصلہ کیا تھا مودودی صاحب اس فیصلے میں موجود تھے۔ یوں ان کے گھٹنے کے ساتھ میرا گھٹنا تھا۔ وہ اس فیصلے میں میرے اور میرے دوسرے ساتھیوں اور تمام علماء کے ساتھ شریک مشورہ تھے۔ اب اس بات سے اگر وہ مکر گئے ہیں تو ہم کیا کریں؟" اس پر آپ نے ایک شعر پڑھا۔

حضرت ناصح نے مے پی کے یہ اچھی چال کی
"محتسب" سے جا ملے رندوں کے "مخبر" ہو گئے

غالب کے شعر آپ کو خاص طور پر بڑے پسند تھے۔ اکثر و بیشتر اپنی تقاریر اور نجی محافل میں پڑھتے اور کچھ اس انداز سے کہ سننے والوں پر سحر طاری ہو جاتا۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کافی عرصہ تک دہلی میں مقیم رہے۔ روزانہ کسی نہ کسی جگہ پر مجلس احرار اسلام اور جمعیت العلماء ہند کا ایک مشترکہ اجتماع ہوتا تھا۔ جس میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ شریک ہوتے۔ ان جلسوں میں میں بھی مجلس احرار اسلام کے ایک رضا کار کے طور پر شریک ہوتا تھا۔ ایک ایسے ہی جلسے میں احرار رضا کاروں نے مسلم لیگیوں کی پٹائی بھی کی تھی۔ یہ جلسہ لیگ کے گڑھ "پل بنگش" کے علاقے "جناح پارک" میں ہوا تھا۔ ایک مسجد کے سامنے ایک بڑا ہی وسیع میدان تھا۔ جسے پنڈال کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اس کے ارد گرد کچی دیوار تھی۔ دیوار کے ارد گرد احرار اسلام کے جاں نثار ہزاروں باوردی رضا کار اپنی

اپنی ڈیوٹی پر موجود تھے۔ میری ڈیوٹی مسجد کے اوپر اس کی چھت پر لاؤڈ سپیکر کے ایک مائیک پر تھی۔ میں چونکہ بلندی پر تھا اس لئے پوری جلسہ گاہ میرے سامنے تھی اور میں ایک بڑی ہی اچھی جگہ سے سارے جلسے کا نظارہ کر رہا تھا۔ جلسے سے شوش کاشمیری، مولانا احمد سعید دہلوی اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہم کے علاوہ امیر شریعت نے بھی خطاب کیا تھا۔ مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی کو پہلی مرتبہ اسی جلسہ میں دیکھا اور سنا تھا۔ وہ کیا تقریر تھی کہ آج تک اس کی گونج میرے ذھن میں محفوظ ہے۔ بڑے ہی تیز بولنے والے مقرر تھے۔ احرار میں اتنی تیز بولنے والا کوئی مقرر نہیں تھا۔ صاحبزادہ فیض الحسن کے بارے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ احرار مقررین میں سب سے زیادہ تیز بولتے تھے لیکن مولانا حفیظ الرحمن سیوہاروی کے مقابلے میں وہ بھی ماند تھے کیا غضب کے مقرر تھے۔ اتنی تیزی کے ساتھ تقریر کرنے والا میں نے ساری زندگی میں نہیں سنا۔ تقریر کیا کرتے یوں محسوس ہوتا کہ کوئی مردِ مجاہد میدان کارزار میں اپنے دونوں ہاتھوں سے تلوار چلا رہا ہو۔ الفاظ آپ کی زبان سے اتنی تیزی اور تسلسل کے ساتھ نکلتے تھے جیسے کوئی مشین گن گولیوں کی بوچھاڑ کر رہی ہو۔ بلا کی کشش اور غضب کی گرفت تھی۔ مولانا احمد سعید دہلوی کو بھی پہلی مرتبہ اسی جلسے میں ہی سنا اور دیکھا۔ کیا خوبصورت چہرہ تھا۔ شرافت اور متانت کی بولتی تصویر دکھائی۔ جلسے کے اردگرد مسلم لیگی بھی ہزاروں کی تعداد میں موجود تھے جو مخالفانہ نعرہ بازی کر رہے تھے جس کی وجہ سے مقررین کو تقریر کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ مولانا حفظ الرحمن اور مولانا احمد سعید نے تو ان حالات میں اپنی تقریر جاری رکھی لیکن جب آغا شورش کاشمیری نے تقریر شروع کی تو وہ بھلا مخالفت میں نعرہ بازی کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ چنانچہ آغا صاحب نے صورت حالات پر برہمی کا اظہار کرتے ہوئے احرار رضا کاروں کو انہیں بھگا دینے کا حکم صادر فرمایا۔ بس پھر کیا تھا۔ میں اوپر چھت سے اس پٹائی کا نظارہ کر رہا تھا جو احرار رضا کاروں نے ان لیگی نعرہ زن افراد کی کی تھی۔

آغا صاحب کے بعد امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر تھی۔ اس جلسے میں بھی آپ نے قیام پاکستان کے حوالے سے اپنے ان خدشات کا اظہار کیا جو آپ عموماً ان دنوں کی تقریر میں کیا کرتے تھے۔ یہ خدشات قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگی قیادت نے اپنی ضد اور حماقت سے پورے کر کے دکھا دیئے ہیں اور جو باقی رہتے ہیں وہ بھی ان سے توقع ہے کہ خدانخواستہ ضرور پورے کریں گے۔

اسی طرح کا ایک جلسہ ہمارے محلہ بلی ماراں میں بھی ہوا۔ جس کو اس وقت کے سپرنٹنڈنٹ پولیس "مسٹر ٹیل" نے اشک آور گیس اور لاٹھی چارج کے ذریعہ سے درہم برہم کر دیا تھا۔ یہ انگریز ایس۔ پی یقیناً وہی ہے جس نے ۱۹۳۹ء کی تحریک قومی بھرتی بائیکاٹ کے دوران ملتان کے جلسہ عام میں شورش کاشمیری کو دورانِ جلسہ تقریر کرتے ہوئے گرفتار کیا تھا۔ یہ لاٹھی چارج بھی انتہائی شدید تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ لوگ بیچارے جوتے اتار کر اور قمیض اتارے ہوئے دریوں پر بڑے آرام سے بیٹھے ہوئے تھے۔ شاہ جی ابھی جلسہ گاہ

میں تشریف نہیں لائے تھے۔ انور صابری سٹیج پر اپنی نظم پڑھ رہے تھے۔ کہ پولیس نے بلا متنبہ کئے مجمع پر لاٹھی چارج کر دیا۔ لوگ ادھر ادھر بھاگ گئے۔ کئی افراد زخمی بھی ہوئے جس کو جہاں پناہ ملی اس جگہ کو غنیمت سمجھ کر وہیں دبک گیا۔ میں بھی ایک مکان کی سیڑھیوں میں پناہ گزیں ہوا۔ اتفاق کی بات ہے کہ انور صابری بھی وہیں پر مجھ سے پہلے موجود تھے۔ موٹے جسم کے آدمی گرمی بے تحاشا ان کا سانس اتنی تیزی سے چل رہا تھا کہ تمام لوگوں کو بڑی آسانی سے آواز سنائی دے رہی تھی۔ بہر حال پولیس جب اپنا کام کر کے وہاں سے رخصت ہوئی تو ہم لوگ سیدھے اس مکان پر پہنچے جہاں اسیر شریعت قیام پذیر تھے۔ وہاں پر موجود سب لوگوں کو پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی کہ جلسہ پولیس تشدد کی نذر ہو چکا ہے۔ میرے بعد جلد ہی انور صابری صاحب بھی اسی مکان پر تشریف لائے۔ ہانپتے کانپتے ہوئے، ش سانس پھول رہی تھی۔ گرمی سے برا حال تھا۔ شاہ جی کو خطاب کرتے ہوئے کہا

"مروا دیا شاہ جی آج تو آپ نے واقعی ہی مروا دیا۔ پولیس ظالم نے اتنا شدید لاٹھی چارج کیا ہے کہ خدا کی پناہ۔ ظالموں کو ذرہ ترس نہیں آیا نہ جانے کتنے لوگ زخمی ہو گئے ہیں۔ آپ تو غالباً پہلے ہی بھانپ گئے تھے اسی لئے جلسہ گاہ میں تشریف نہیں لائے"؟

شاہ جی انور صابری کی اس تقریر پر مسکرا رہے تھے اور کہہ رہے تھے

"احرار کے جلسوں میں نظمیں پڑھتے ہو تو ذرا ہمت سے کام لو ہمارے ساتھ تو نہ جانے کب سے یہ کام ہو رہا ہے اور نہ جانے کب تک ہوتا رہے گا؟"

ہم جلسہ کے درہم برہم ہونے کے بعد کافی دیر تک شاہ جی کے ساتھ اس مکان میں محو گفتگو رہے اور بھی بہت سے لوگ وہاں پر موجود تھے۔ میرے والد محترم جناب نذیر مجیدی مرحوم بھی میرے ساتھ اس وقت موجود تھے۔ ہم گھر سے اکٹھے ہی جلسے میں شرکت کے لئے آئے تھے۔ جب بھی ہم اٹھ کر جانے کی کوشش کرتے تو لوگ یہ کہہ کر ہم دونوں کو روک دیتے کہ باہر پولیس والے موجود ہیں اور لوگوں کو تنگ کر رہے ہیں۔ بعض لوگوں کو گرفتار بھی کر چکے ہیں۔ لہذا ذرا کچھ دیر اور رک جاؤ! ہم پھر بیٹھ جاتے لیکن آخر جب رات ڈھل گئی تو مجھے والد صاحب نے کہا کہ "آؤ اب چلیں" کوچہ رلھن سے ہمارا گھر کچھ زیادہ دور نہیں تھا لیکن حالات کی کشیدگی کی وجہ سے ایک ان جانا سا خوف میرے دل و دماغ پر ضرور تھا۔ میں ساتویں جماعت کا طالب علم بھلا کہاں تک بہادر ہو سکتا تھا؟ جب ہم باپ بیٹا دونوں مکان سے باہر آئے تو ایک آدمی ہمیں سامنے سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ جس نے ہمارے قریب آتے ہی میرے والد صاحب سے کہا بچے کو سرخ قمیض پہنا کر کہاں لئے جا رہے ہو پولیس تو سرخ قمیض والوں کو تلاش کر رہی ہے کیا بچے کو گرفتار کروانے کا ارادہ ہے؟ میں ڈر کر رک گیا اور فوراً ابا جی سے کہا کہ ابا جی میں قمیض اتار دوں" مجھے والد صاحب کا جواب آج تک یاد ہے فرمانے لگے۔

"یا تو سرخ قمیض پہنتے نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ سرخ قمیض اب انگریز دشمنی

کی علامت بن چکا ہے اور اگر ایک مرتبہ پہن لی جائے تو اسے اتارتے نہیں۔ لہذا اب خواہ کچھ ہو جائے تم اسے نہیں اتار سکتے، خدا پر بھروسہ رکھو اور چلو؟"

چنانچہ ہم پولیس والوں سے بچ بچا کر بخیریت اپنے گھر پہنچ گئے لیکن میں نے وہ سرخ قمیض اس وقت اتاری اور نہ ہی آج تک اسے اتارا ہے وہ یوں کہ میں آج بھی تحریک احرار سے اسی طرح متاثر ہوں جس طرح اس وقت تھا بلکہ اب میں زیادہ پختگی کے ساتھ اس پر قائم ہوں، میرا ایمان ہے کہ احرار کی یہ اسلامی تحریک برصغیر کی وہ پہلی اسلامی انقلابی تحریک ہے جس نے بڑی بہادری کے ساتھ اپنی لڑائی لڑی۔ اس کے دو بڑے محاذ تھے۔ ایک جنگ آزادی دوسرا احیاء و نفاذ اسلام، اس تحریک کو بہ ظاہر ختم کرنے میں دو بڑی سرمایہ دار جماعتوں کا یکساں کردار ہے جن کو عرف عام میں مسلم لیگ اور کانگریس کہتے ہیں۔ جن کو نہ تو اسلام قبول تھا اور نہ ہی غریب، احرار آج بھی اسی مقام پر موجود اور اسی مؤقف پر قائم ہیں جو ان کے اکابرنے ان کے لئے منتخب کیا تھا۔ ان عزائم اب بھی بلند ہیں۔

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر ہو کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

یا پھر میرا اپنا ایک شعر اسی کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے۔

ہے ناؤ شکستہ سی اور بادِ مخالف بھی
پر عزم جواں اپنا آئے تو بھنور آئے

ایک دن میں کوچہ رحمٰن کے اسی مکان میں موجود تھا۔ اس وقت احرار کابینہ کے تمام مقتدر رہنما میرے سامنے موجود تھے۔ جن میں شیخ حسام الدین، شورش کاشمیری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہاں البتہ آج ان میں ایک شخصیت کا اضافہ تھا۔ یہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی تھے جن کو میں نے پہلی دفعہ اسی روز دیکھا تھا۔ کیا پر رعب شخصیت تھی۔ عینک کے بھاری شیشوں کے نیچے سے بڑی عقابی آنکھیں اتنی پُرہول تھیں کہ ان پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ یہ سب رہنما ایک دائرہ میں فرش پر بچھی دریوں پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص تقریباً کچھ خربوزے لیکر آیا۔ خربوزے اس کے اپنے کھیت کے تھے۔ اور تھے بھی اعلیٰ قسم کے۔ ایک ایک خربوزہ کے آگے رکھ دیا گیا۔ ہر ایک نے اپنے اپنے خربوزے کو کاٹا اور کھانا شروع کیا۔ شورش کاشمیری نے بھی اپنا خربوزے کو کاٹا اور کھانا شروع کیا تو میں بیٹھا دیکھ رہا تھا کہ ان کے چہرے کے تاثرات کچھ اچھے نہ تھے۔ شاید خربوزہ میٹھا نہ تھا۔ اسی دوران حضرت امیر شریعت نے اپنا خربوزہ کاٹ کر کھایا تو آپ نے چکھتے ہی اپنے مخصوص انداز میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا شروع کر دیا۔ شورش بھانپ گئے کہ شاہ جی کا خربوزہ بہتر ہے۔ خوشبو سے سارا کمرہ معطر ہو رہا تھا۔ شورش نے بھی اپنے خربوزے کی تعریف شروع کر دی۔ واہ کیسا میٹھا ہے اور کیسا خوشبودار اس کے ساتھ ہی شورش اپنی جگہ سے اٹھے اور اپنے

خربوزے کو اٹھا کر شاہ جی کے سامنے رکھ دیا اور شاہ جی کے سامنے سے ان کا خربوزہ اٹھا کر اپنے آگے رکھ کر کھانا شروع کر دیا۔ اب جو شاہ جی نے شورش والے خربوزے کو کاٹ کر چکھا تو سب کچھ بھانپ گئے۔ مجھے اچھی طرح اب یاد ہے کہ شاہ جی کے منہ کے ساتھ خربوزے کی پھانک لگی ہوئی ہے اور شاہ جی کی آنکھیں شورش کے چہرے پر اور پنجابی میں کہہ رہے ہیں۔

"پتر پیو نال وی دا کھیڈ گیاں ناں؟"

شاہ جی کا یہ کہنا تھا کہ شورش کھلکھلا کر ہنس پڑا جس کے ساتھ ہی ساری محفل کشت زعفران بن گئی۔ اب سوچتا ہوں کہ یہ سب کیسے عظیم لوگ تھے اور کیسی محفلیں تھیں آپس میں کس طرح شیر و شکر اور دشمنوں کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار۔ یقیناً جو لوگ آپس میں محبت کرنے والے ہوتے ہیں وہی کفار کے مقابلے میں سخت جان ثابت ہوتے ہیں۔ اکابر احرار اشداء علی الکفار رحماء بینھم کی عملی تفسیر تھے

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

اسی طرح ایک دوسرے روز کی بات ہے کہ ہم سب اسی مکان میں بیٹھے تھے کہ شورش نے بار بار کہنا شروع کر دیا۔ کہ "چلو شاہ جی چلیں" دو ایک بار تو شاہ جی نے شورش کی بات پر کچھ توجہ نہ دی لیکن جب شورش کا اصرار زیادہ ہو گیا تو کہنے لگے "اچھا بھائی چلتے ہیں" جیسے شاہ جی کا اپنا جی نہ ہو اور مجبوراً ہاں کہہ رہے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ شورش شاہ جی کو کہیں لیکر جانا چاہتے ہیں۔ پھر شورش نے کہا کہ شاہ جی ملاقات کا وقت قریب آگیا ہے اٹھیں اور تیار ہو جائیں۔ شاہ جی اٹھے اور اپنے موٹے کھدر کی شلوار قمیض کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے۔

"اس گاندھی کی بھی سن لو، لوگوں کو کہتا پھرتا ہے کہ کھدر پہنو۔ اور خود اس نے ساری زندگی کھدر کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ پوری زندگی ململ کی ایک لنگوٹی میں بسر کر دی۔ اب لوگ ہیں کہ موٹا کھدر پہن رہے ہیں۔ میری طرف ہی دیکھو یہ قمیض تقریباً چار سیر کی تو ہو گی اور اتنی ہی بھاری یہ میری شلوار ہے"

حضرت شاہ جی شلوار قمیض پہن کر شورش کے ساتھ چلے گئے۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی کے ساتھ ملاقات کا وقت ہے۔ اس لئے شاہ جی اسے ملنے کے لئے شورش کے ساتھ گئے ہیں۔ شورش نے اپنی کتاب "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" کے دوسرے ایڈیشن میں یہ واقعہ ذرا تفصیل کے ساتھ لکھ دیا ہے جس سے تائید ہو گئی ہے کہ آپ دونوں گاندھی کو ہی ملنے گئے تھے۔ دہلی میں ان دنوں تقریباً ہر مشہور مقام پر جمیعتہ العلما ہند اور مجلس احرار اسلام کے اشتراک سے جلسے منعقد ہو رہے تھے۔ غالباً مدنی فارمولا کی حمایت میں ان جلسوں کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ "مدنی فارمولا" کے بارے میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ جب ان دونوں جماعتوں کی جانب سے اتفاق رائے کے ساتھ بجائے پاکستان مدنی فارمولا پنڈت نہرو کو پیش کیا گیا

تو اس نے اسے مسترد کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"اس سے بہتر یہ ہے کہ ہم پاکستان کی تجویز تسلیم کر لیں کیونکہ یہ فارمولا تو ہندوستان کے ہندوؤں کے لئے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوگا!

دہلی کے یہ متحدہ اجتماعات اسی تجویز کو شاید مؤثر بنانے کے لئے کئے جا رہے تھے۔ یہ وقت ہندوستان کی سیاست میں انتہائی مشکل، تیز اور نہایت اہم مرحلہ تھا۔ ہر سیاسی جماعت اپنی حیثیت کے مطابق پہلے سے زیادہ فعال تھی اور اپنے اپنے مؤقف کے بارے میں بڑی تگ و دو میں مصروف نظر آتی تھی۔ تاکہ ہندوستان کے مستقبل کو اپنی خواہشات کے مطابق اپنے حق میں فتح کر سکیں۔

مجلس احرار کا آخری اور سب سے بڑا جلسہ دہلی کے اردو پارک میں اپریل ۱۹۴۶ء میں منعقد ہوا۔ اس جلسے کی اہمیت اور حیثیت کا اندازہ آپ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ اس میں کہی گئی باتیں آج حرف حرف صحیح اور درست ثابت ہوئی ہیں۔ سب سے اہم تقریر امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تھی۔ اردو پارک کے وسیع و عریض میدان میں شاہی مسجد کے عین سامنے سٹیج لگایا گیا تھا۔ سٹیج کی پشت پر دہلی کے لال قلعے کی عظیم الشان فصیل ایک عجیب سماں پیدا کر رہی تھی۔ لوگوں کا بے مثال اجتماع جسے بلاشبہ انسانوں کا سمندر کہا جا سکتا ہے۔ شاید میری زندگی کا یہ سب سے بڑا جلسہ تھا تاحد نگاہ انسان ہی انسان تھے۔ جن کو احرار کے ہزاروں رضاکاروں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ سٹیج بہت اونچا اور بڑا وسیع بنایا گیا۔ مجلس احرار اسلام کے تمام اکابر سٹیج پر فروکش تھے۔ شیخ حسام الدین، مولانا مظہر علی اظہر، ماسٹر تاج الدین انصاری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، شورش کاشمیری، نواب زادہ نصراللہ خان، مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی (اگرچہ وہ جماعت کو چھوڑ چکے تھے۔ لیکن جلسہ سننے کے لئے تشریف لائے۔ وہ کبھی کبھار کوچہ رحمان میں احرار رہنماؤں کے پاس تشریف لاتے تھے)۔ لیکن یہ سب رہنماء ایک عظیم رہنما کا انتظار کر رہے تھے اور وہ تھے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ شاہ جی سب سے آخر میں تشریف لائے تو شرکاء جلسہ جموم اٹھے عجیب و غریب سماں ان کی آمد پر دیکھنے میں آیا پورا مجمع اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لوگوں کے چہرے خوشی سے دمک اٹھے۔ امیر شریعت زندہ باد کے نعروں سے پوری فضاء گونج اٹھی۔ اسی گونج میں شیخ حسام الدین (جو سٹیج سیکرٹری کے فرائض سرانجام دے رہے تھے) کی آواز بلند ہوئی جیسے کوئی شیر دھاڑ رہا ہو آپ نے کہا!

"میں احرار رضاکاروں کو حکم دیتا ہوں کہ جلسے کے انتظام و فرائض میں کوئی کوتاہی نہ ہو، جس شرپسند کا سر جہاں سے اٹھے اسے وہیں کچل دیا جائے اور ہاں یاد رہے کہ کلہاڑی سیدھی پڑنی چاہیئے حالات کا میں خود ذمہ دار ہوں"

یہ آواز پورے ماحول میں ایک ارتعاش پیدا کر گئی۔ شاہ جی نے چند تقاریر کے بعد لوگوں سے مخاطب ہو کر درود شریف پڑھنے کے لئے کہا۔ خود بھی درود شریف پڑھتے رہے، لوگ حیران تھے کہ شاہ جی کا یہ آغاز ان کے معمول کے مطابق نہیں تھا۔ دفعتاً امیر شریعت نے فرمایا کہ میں نے دانستہ درود شریف پڑھوایا ہے

کیونکہ مجھے یقین ہے کہ صبح کو ہمارے مخالفین نے اپنے اخباروں میں یہی کچھ لکھنا ہے کہ عطاء اللہ شاہ نے اگرچہ لاکھوں کے مجمع کو خطاب کیا لیکن ان میں مسلمان ایک بھی نہیں تھا۔ سب غیر مسلم اکٹھے کر رکھے تھے۔ اب کم از کم وہ یہ بات نہیں لکھ سکیں گے۔ لاکھوں نے خود درود شریف پڑھا اور سنا ہے۔ جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ عمدہ مجمع مسلمانوں کا ہے جو بخاری کی باتیں سننے کے لئے آیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے اپنی تاریخی تقریر کا آغاز باقاعدہ خطبہ مسنونہ کے ساتھ کیا اور یوں پوری رات آپ نے اس عظیم الشان اجتماع سے خطاب کرنے میں بسر کر دی۔ تقریر کیا تھی شاہ جی کی سیاسی بصیرت اور روحانی عظمت کا ایک حسین مرقع جس میں آپ نے آنے والے سیاسی حالات کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار فرمایا تھا۔ جو وقت نے صحیح اور درست ثابت کر دیئے ہیں۔ پاکستان بنے ۴۷ سال بیت چکے ہیں لیکن کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان میں ایک بات بھی ایسی ہوئی ہو جس سے بخاری کی تردید ہوئی ہو۔ میں خود جلسہ گاہ میں موجود تھا۔ مجھے سٹیج کے ایک گوشے میں بڑی اچھی جگہ مل گئی تھی۔ جہاں بیٹھ کر میں جلسہ گاہ کا نظارہ کر رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے شاہ جی کا چہرہ تھا۔ جس سے مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میرے بالکل قریب بیٹھ کر تقریر کر رہے ہوں۔ خطبہ مسنونہ کے بعد شاہ جی کے پہلے فقرے کچھ اس طرح تھے۔

"مجھے پاکستان بن جانے کا اتنا ہی یقین ہے جیسے اس بات پر کہ صبح کو مشرق سے سورج طلوع ہونے والا ہے۔ جو اس وقت مسلمانان پاک و ہند کے دل و دماغ میں پاکستان کا جو نقشہ موجود ہے۔ وہ حقیقت سے بالکل مختلف ہو گا۔

وہ پاکستان کیا ہو گا؟ اس پر ساری رات آپ نے تقریر فرمائی۔ لوگ سنتے رہے اور سر دھنتے رہے۔ وہ تاریخی لمحات گزر گئے لیکن جو جو باتیں آپ نے فرمائیں وہ ایک ایک پوری ہو کر رہی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جو نتائج سامنے آئے ہیں ان سے شاہ جی کی کہی ہوئی باتوں کی تائید ہوتی ہے۔ قائدین تحریک پاکستان چاہتے تو ان خدشات کو سامنے رکھ کر اس دھرتی پر حکومت کر سکتے تھے۔ اور ان خطرات سے ملک محفوظ بھی رہ سکتا تھا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔

ہے حقیقت بس وہی جو تو نے کر دی تھی عیاں
اور سب کچھ وقت کی آنکھوں میں تھا مثل سراب
تجھ پہ جو الزام تھا رد ہو گیا ہے وقت سے
تیرے نکتہ چیں ہوئے ہیں شرم سے اب آب آب

اس تاریخی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے کہا تھا

"بھائی بات لڑنے اور جھگڑنے کی نہیں سمجھنے کی ہے۔ تم ایک ملک پر اسلام کی حکومت کی بات کرتے ہو۔ مجھے تم اس بات کا یقین دلا دو کہ کل کو کسی گاؤں کے کونے پر اسلام نافذ ہونے والا ہے۔ تو میں اپنا سب کچھ چھوڑ کر تمہارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن جو لوگ اپنی ڈھائی من کی

لاش اور چھے فٹ کے قد پر اسلام نافذ نہیں کر سکتے۔ جن کا اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا، سونا، جاگنا، وضع قطع، لین دین، شکل و صورت، لباس و معاملات، طور طریقے، کچھ بھی اسلام کے مطابق نہیں ہے ان سے میں کیسے توقع رکھوں کہ وہ ایک ملک پر اسلام کی حکومت قائم کر دیں گے۔ یہ ایک فریب ہے اور میں یہ فریب کھانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

تم یہ ملک چلاؤ گے کیسے۔ مجھے یہ تو سمجھا دو (کلہاڑی ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے اسے بلند کر کے کہا) یہ ہمارا مشرقی پاکستان ہو گا۔ اور یہ مغربی پاکستان۔ درمیان میں ہزاروں میلوں پر مشتمل ہندوؤں کی حکومت ہو گی۔ ہندو، کون ہندو؟ مکار ہندو، عیاش ہندو جن کو تم نے اتنے لمبے عرصے تک غلام بنائے رکھا وہ تم سے اس کا انتقام لیں گے۔ تمہیں طرح طرح سے تنگ کریں گے۔ کبھی تمہارے دریاؤں کا پانی بند کر دیا جائے گا۔ کبھی تمہاری سرحدوں پر فوج کھڑی کر دی جائے گی اور تمہاری حالت یہ ہو گی کہ بوقت ضرورت مشرقی پاکستان والے مغربی پاکستان کی مدد نہیں کر سکیں گے اور مغربی پاکستان والے مشرقی پاکستان کی مدد نہیں کر سکیں گے۔ جناح سے کہہ دو۔ یہ بات مجھے سمجھا دے کہ یہ ملک کیسے قائم رہے گا۔ بس ایک بار مجھے سمجھا دو۔ پھر تم گھر بیٹھ جانا میں اور میرے رضا کار تمہاری اس تحریک کو اکیلے کامیاب کر دیں گے۔ لیکن یہ تم سے نہ ہو سکے گا۔

"پاکستان کے اندر کیا ہو گا۔ چند خاندانوں کی حکومت ہو گی۔ وہ خاندان جو ٹوڈی خاندان کہلاتے ہیں۔ جاگیردار اور سرمایہ دار خاندان، ان کی لوٹ کھسوٹ سے پاکستان کے غریب، دن بہ دن غریب سے غریب تر ہوتے چلے جائیں گے اور امیر، امیر سے امیر تر یہی چند خاندان اپنے سرمایہ کے بل بوتے پر پورے ملک پر حکومت کریں گے اور غریبوں کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہو گا۔ اسلام ایک مسافر کی طرح ہو گا"

شاہ جی کی یہ تاریخی تقریر صبح تک جاری رہی۔ نماز فجر کی اذان کے ساتھ جلسے کے اختتام کا اعلان ہوا۔ قیام پاکستان سے پہلے دہلی میں شاہ جی کی یہ آخری تقریر تھی۔

دہلی میں سیاسی فضا میں بلا کی کشیدگی تھی۔ ایک زبردست تموج تھا۔ جلسے جلوس روزمرہ کا معمول بن چکے تھے۔ مسلم لیگ، کانگرس، مجلس احرار اسلام اور دوسری سیاسی جماعتیں بڑی فعال نظر آتی تھیں۔ انگریزی حکومت نے یہ بھانپ لیا تھا کہ ہندوستان میں ان کے اقتدار کے دن اب تھوڑے رہ گئے ہیں۔ اگرچہ سیاسی جماعتوں کا مؤقف اور مشن ایک دوسرے سے جدا اور مختلف تھا۔ تاہم ایک بات سب میں مشترک تھی کہ ہندوستان کو آزادی دی جائے۔ اختلاف اگر تھا تو اس بات پر کہ آزادی کی شکل کیا ہو، دوسری جنگ عظیم میں فتح انگریزوں کا مقدر ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہیں ہندوستان میں اپنی شکست بھی سامنے نظر آ رہی تھی۔ محکمہ ڈاک ہڑتال، نیوی کے اندر زبردست ہڑتال، لوگوں کی بڑھتی ہوئی بے چینی اور انگریزوں

کے خلاف ان کا اظہار نفرت، ان حکمرانوں پر عیاں ہو چکا تھا۔ دہلی کے حالات سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ انگریز اپنا بوریا بستر باندھ رہا ہے۔ حکومت نے جاپان کی فتح پر جشن فتح منانے کا اعلان کر دیا۔ جشن فتح کی تیاریاں حکومت کی طرف سے بڑی دھوم دھام سے شروع ہو گئیں۔ لیکن اس جشن کو ناکام بنانے کے لئے بھی پروگرام وضع کر لئے گئے۔ جس روز جشن فتح کا اعلان تھا۔ اس روز شہر میں مکمل ہڑتال تھی۔ چاندنی چوک اور ماراں کی پوری آبادی جس میں ہندو، سکھ اور مسلمان سبھی شامل تھے سڑکوں پر نکل آئے۔ لوگوں کی ٹولیاں ادھر ادھر انگریزوں کے خلاف نعرے لگاتی پھر رہی تھی۔ سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر دیں گئیں تاکہ پولیس کے تعاقب سے محفوظ رہا جاسکے۔ عوام نعرے لگاتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔ ہر سرکاری عمارت جس کو سجایا گیا تھا عوامی توڑ پھوڑ کا شکار ہو رہی تھی۔ درختوں پر لگائے گئے برقی قمقمے لوگوں کے ڈنڈوں کی زد میں تھے۔ رفتہ رفتہ جذبات میں شدت پیدا ہو گئی۔ سرکاری عمارتوں پر حملے کئے گئے، بجلی گھروں کو جلا دیا گیا۔ پولیس نے اشک آور گیس کی بارش کر دی تھی۔ لوگ اس پر بھی باز نہ آئے تو پھر کئی جگہوں پر گولی چلائی گئی کئی افراد ہلاک ہوئے اور سینکڑوں زخمی۔ ٹیلی فون اور بجلی کے تار کاٹ دیئے گئے۔ بجلی کے کھمبے دوہرے کر دیئے گئے۔ غرضیکہ پورا دن پولیس اور لوگوں کے درمیان ایک مسلسل جنگ کی صورت برقرار رہی اور اسی کشمکش میں شام ہو گئی۔ لیکن روشنی کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ پورا شہر دہلی تاریکی میں ڈوبا ہوا انگریزی ظلم و ستم پر ماتم کناں تھا۔ لیکن اس بات پر ہر شخص خوش بھی ضرور تھا کہ انگریزوں کا جشنِ چراغاں اندھیرے میں ڈوب چکا ہے۔ شاید یہ کیفیت ویسی ہی ہو، یہ اندھیرا اپنی نوعیت اور کیفیت کے اعتبار سے وہ یسا ہی ہو جو ان دنوں تھا جب ہڈسن کی قیادت میں دہلی والوں پر ظلم و ستم کی انتہا کر دی گئی تھی۔ بے پناہ تشدد اور بے پناہ قتل و غارت کر کے دہلی والوں کو عتاب کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ لیکن آج کے اندھیرے اور ۹۰ سال پہلے کے اندھیرے میں ایک فرق ضرور تھا۔ کہ ظلم کی رات کے آغاز کا اندھیرا تھا اور یہ صبح صادق سے ذرا پہلے کا اندھیرا تھا اس غلامی کے اندھیرے کو آزادی کی روشنی میں تبدیل کرنے کے لئے ایک طویل اور انتھک جدوجہد، کو عمل دخل حاصل رہا۔ پاک وہند کی غلام فضا میں سانس لینے والوں کو آزاد فضاؤں سے روشناس کرانے کے لئے نہ جانے کتنی قربانیاں دینا پڑیں۔ اس تگ و دو میں کتنی جوانیاں کام آئیں۔ کتنے بڑھاپے بے سہارا ہوئے اور نہ جانے کتنے سہاگ اجڑ گئے اور اس کوشش اور کاوش میں اللہ کے فضل و کرم سے مجلس احرار اسلام کا حصہ وافر ہے۔ مجلس احرار نے حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ولولہ انگیز قیادت میں ایک نیا جوش پیدا کیا، انگریز دشمنی کا وہ بیج بویا کہ تشدد کے سائے میں بھی وہ اب تناور درخت بن چکا تھا۔ جس کو اکھاڑنا انگریزوں کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ لیکن آزادی کے بعد ہم نے یہ سب کچھ بھلا دیا۔ کہ کتنی بڑی قربانیوں کے بعد اللہ نے ہمیں یہ نعمت عطاء کی تھی۔ اے کاش آزادی کی یہ نعمت احیائے اسلام اور اتحاد بین المسلمین کا ذریعہ بنتی۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ اس پر جتنے بھی آنسو گرائے جائیں کم ہیں۔

جس صبح کا وعدہ تھا اس دیس کے لوگوں سے
اے کاش کبھی خالد وہ بھی تو سحر آئے

۱۹۴۶ء کے آخر میں ہم پنجاب (چنیوٹ) چلے آئے۔ چند روز رشتہ داروں کے درمیان رہ کر واپس دہلی جانے کا پروگرام تھا۔ والد محترم نذیر مجیدی دہلی میں اچھا بھلا کام کر رہے تھے۔ مکان اور کارخانہ جہاں ہمارے کاریگر جفت سازی کا کام کرتے تھے وہیں چھوڑ آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کو ہمارا دوبارہ دہلی جانا منظور نہیں تھا۔ مجھے تپ محرقہ ہوا اور طویل ہو گیا۔ میری تیمارداری اور بیماری دہلی واپس جانے کے راستے میں حائل ہو گئی۔ پھر فسادات تیز ہو گئے اور قیام پاکستان کا اعلان ہو گیا۔

قیام پاکستان کے بعد غالباً ۱۹۴۷ء میں فیصل آباد (جو اس وقت لائل پور تھا) میں ایک بہت بڑی احرار کانفرنس منعقد ہوئی۔ چنیوٹ جسے پنجاب میں مجلس احرار اسلام کے اہم مرکز کی حیثیت حاصل تھی اس کانفرنس کی تیاریوں میں پیش پیش تھا۔ گردونواح کی بستیوں سے بھی احرار رضاکار چنیوٹ پہنچ گئے اور ایک بہت بڑا جیش لائل پور کے لئے روانہ ہوا۔ دھوبی گھاٹ جو اب اقبال پارک کے نام سے موسوم ہے میں کانفرنس کا اہتمام تھا۔ وسیع پنڈال میں ہر جگہ مختلف شہروں سے آنے والوں جیوش کے خیمے لگے ہوئے تھے یہ پورا علاقہ احرارستان کا سماں پیش کر رہا تھا۔ غالباً دو روزہ کانفرنس تھی۔ صبح کو رضاکاروں کے مظاہرے شہر میں پریڈ اور رات کو اجتماع ہوئے۔ جلسہ گاہ میں داخلہ بذریعہ ٹکٹ تھا ہمارے شہر کے ایک رضاکار محمد حسین اور چند دوسرے رضاکاروں کی گیٹ پر ڈیوٹی تھی شاہ جی جب اپنے ساتھ کافی لوگوں کے ہمراہ گیٹ پر اندر داخل ہونے کے لئے تشریف لائے تو محمد حسین نے شاہ جی سے داخلہ ٹکٹ طلب کر لیا جو غالباً ایک روپے کے عوض دستیاب تھا۔ شاہ جی نے کہا کہ بھائی ٹکٹ تو میرے پاس نہیں ہے جواب میں محمد حسین نے کہا کہ پھر جائیے اور ٹکٹ لے کر آئیے شاہ جی نے رضاکار کے حکم کی تعمیل کی اور جا کر باقاعدہ ٹکٹ خریدا جس کے ساتھ ہی ان تمام لوگوں کو بھی ٹکٹ خریدنا پڑا جو آپ کے ہمراہ تھے بعد میں شاہ جی نے محمد حسین کو شاباش دی اور اس کے اس کام کو سراہا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ رضاکار اور احرار رہنما ڈسپلن کے معاملے میں کتنے پابند تھے۔ رضاکار کا اعتماد اور رہنما کی تعمیل دونوں قابل ستائش ہیں۔ اسی نظم و ضبط اور رضاکارانہ تنظیم نے مجلس احرار اسلام کو کو ایک زبردست قوت بنا دیا تھا۔ اجلاس میں شورش کاشمیری اور جنرل شاہنواز (آزاد ہند فوج) بھی تشریف لائے اور انہوں نے بھی احرار کانفرنس کو خطاب فرمایا۔ نور محمد دستکاری سکول کی عمارت میں حرار کی مجلس عاملہ کی میٹنگ ہوئی۔ دروازے پر میری ڈیوٹی تھی۔ سالار اعلیٰ کا مجھے حکم تھا۔ کہ کوئی شخص اوپر نہ جائے چنانچہ میں نے اسی حکم کے تحت صاحبزادہ فیض الحسن شاہ اور مولانا محمد علی جالندھری کو روک دیا۔ یہ دونوں احرار لیڈر اس وقت تک میرے حکم پر رکے رہے جب تک سالار اعلیٰ نے انہیں اجازت نہیں دی۔ یہ تھا ہماری جماعت کا رضاکارانہ نظام جو ہماری قوت کی اصل بنیاد تھی۔ وہ

رضاکار جو باہر اپنے رہنما کے حکم پر جیل جانے اور گولی کھانے تک کو تیار ہو جاتے تھے۔ جماعتی ڈسپلن میں وہی رہنما رضاکاروں کے حکم کی تعمیل میں خوشی محسوس کرتے تھے۔ جس سے رضاکاروں میں اعتماد اور نظم و ضبط کی خوبی پیدا ہوتی تھی۔ جو دین کے عسکری نظام کا ایک بہت اہم رکن ہے۔ لائل پور کی یہ کانفرنس قیام پاکستان کے بعد مجلس احرار کی سب سے اہم کانفرنس تھی۔ جو ہر لحاظ سے کامیاب رہی۔ رضاکارانہ تنظیم تو ہر لحاظ سے اپنے عروج پر تھی۔ قیام پاکستان کے بعد ایک نیا ولولہ نیا جذبہ، نرالا انداز کار دیکھا گیا۔ جذبہ جہاد سے سرشار ہر رضاکار عزم و استقلال کا نشان بنے اپنے ہائی کمانڈ کے حکم پر جان نچھاور کرنے کے لئے پوری طرح تیار نظر آتا تھا۔

اس کانفرنس کے بعد مارچ ۱۹۴۹ء میں لاہور کی دفاع کانفرنس کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ جو دہلی دروازے کے باہر منعقد ہوئی۔ ربیع الاول کے مہینے میں عید میلاد النبی کے جلوس میں پاکستان بھر سے آنے والے احرار رضاکاروں نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ جماعت کا یہ عسکری نظام قابل دید تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں احرار سرخیوش سارا دن لاہور کی سڑکوں پر مارچ کرتے رہے، لاہور، سیالکوٹ اور گوجرانوالہ لائل پور کے احرار بینڈ فوجی دھنوں کے ساتھ ایک عجیب سماں پیدا کر رہے تھے۔ فوجی بینڈ کی دھنوں پر رضاکاروں کی عسکری پریڈ نے لوگوں کو مبہوت کر دیا۔ لوگ حیران تھے کہ یہ ٹریننگ احرار رضاکاروں نے کیسے حاصل کی۔ مجھے یاد ہے کہ لاہور قلعہ کے جنوبی دروازے پر اس وقت کے پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ کو احرار رضاکاروں نے سلامی بھی دی تھی۔ دفتر احرار میں احرار رہنماؤں کی اہم میٹنگ جاری تھی اور اسی میٹنگ کے نتیجے میں احرار نے اپنی نئی حکمت عملی وضع کی۔ احرار کو عارضی طور پر سیاست سے علیحدہ کر لیا گیا۔ اور سیاسی کام کے لئے مسلم لیگ سے تعاون کا فیصلہ ہوا۔ جبکہ جماعت کو دینی، سماجی اور تبلیغی سرگرمیوں تک محدود کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ رہنماؤں نے یہ فیصلہ تو کر لیا لیکن اس کے بعد مرحلہ یہ تھا کہ جلسہ میں اس فیصلے کا اعلان کون کرے گا۔ تاثر یہ تھا کہ رضاکار اس فیصلے کو شاید تسلیم نہ کریں کیونکہ ان کی اکثریت پاکستان میں مسلم لیگ کے لئے حزب اختلاف کی حیثیت میں کام کرنے کے لئے ذہنی طور پر ہر طرح سے تیار تھی۔ جب کوئی بھی رہنما اس اہم اعلان کے لئے تیار نہ ہوا تو شاہ جی نے یہ کام بھی اپنے ذمے لے لیا۔ چنانچہ رات کے اجتماع میں جب جلسہ گاہ میں شاہ جی نے احرار کی سیاسی حیثیت کو ختم کر کے سیاسی کام کے لئے مسلم لیگ سے تعاون کے فیصلہ کا اعلان کیا تو میں نے رضاکاروں کو اپنے اپنے خیموں میں بے تحاشہ روتے ہوئے دیکھا اور بعض اوقات تو سسکیوں کی یہ آواز بھی جلسہ گاہ میں سنائی دیتی تھی۔ اس کے باوجود فیصلے کی تعمیل کی گئی احرار رضاکاروں اور رہنماؤں کی ایک محدود تعداد نے مسلم لیگ میں شمولیت بھی اختیار کی۔ یہ الگ بات ہے کہ مسلم لیگ سے عوامی لیگ اور عوامی لیگ کا چکر کاٹ کر کچھ لوگ دوبارہ احرار میں شامل ہو گئے۔ اسی اجتماع میں امیر شریعت نے پاکستان کے بارے میں کہا کہ

"قیام پاکستان سے پہلے ہماری رائے ایک اصول پر مبنی تھی۔ وہ قصہ اب ختم ہو گیا۔ قیام پاکستان کے بعد ہم اپنی رائے کی شکست کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہ ملک ہمارے لئے بھی اتنا ہی مقدس ہے جتنا کسی دوسرے کے لئے ہو سکتا ہے اس ملک کے ساتھ وفاداری میں جزو ایمان سمجھتا ہوں۔ اختلاف کی نوعیت ایسی نہیں ہے کہ اب اسے مرتے دم تک برقرار رکھا جائے اب اسے ختم کر دو۔ پاکستان کی بہتری اور بقا کے لئے ہماری خدمات تمہارے سپرد ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

"میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صدا دیتے پھرتے ہیں کہ میں توشۂ وفاداری لئے پھرتا ہوں میری انگلی پکڑ کر ساتھ لے چلو اور جس مقتل میں چاہو مجھے ذبح کر دو۔ ایسا کبھی نہیں ہو گا ہرگز نہیں ہو گا۔ میں خوش ہوں۔ میری خوشی بیکراں ہے کہ اس ملک سے انگریز نکل گیا۔ میں دنیا کے کسی بھی حصے میں سامراج کو نہیں دیکھ سکتا۔ میں اسکو قرآن اور اسلام کے خلاف سمجھتا ہوں۔"

تم میری رائے کو خود فروشی کا نام نہ دو۔ میری رائے ہار گئی اب اس کہانی کو یہیں ختم کر دو۔ اب پاکستان نے جب بھی پکارا واللہ باللہ اس کے ذرے ذرے کی حفاظت کرونگا۔ مجھے یہ اتنا ہی عزیز ہے جتنا کوئی اور اس کا دعوی کر سکتا ہے۔ میں قول کا نہیں عمل کا آدمی ہوں۔ اس طرف کسی نے آنکھ اٹھا کر دیکھا تو آنکھ پھوڑ دی جائے گی، کسی نے ہاتھ اٹھایا تو ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ میں اس وطن اور اس کی عزت کے مقابلے میں نہ اپنی جان عزیز رکھتا ہوں نہ اولاد۔ میرا خون پہلے بھی تمہارا تھا اور اب بھی تمہارا ہے"

اس موقعہ پر سٹیج پر ہی شاہ جی سے میری ملاقات ہوئی۔ یہ انتہائی مختصر ملاقات تھی۔ میرے ہاتھ میں شاہ جی کا فوٹو تھا۔ خیریت پوچھی بعد میں فرمانے لگے یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے میں نے کہا حضرت آپ کی تصویر ہے۔ کہنے لگے تمہیں بھی تصویر کی ضرورت ہے۔ تم نے میری تصویر کیوں خریدی ہے۔ تصویریں بنانا اور تصویر بیچنا خریدنا چونکہ شرعی طور پر منع ہے۔ اس لئے ان سے منع فرمایا تھا۔ چند لمحوں کی یہ مختصر ملاقات تھی لیکن اس ملاقات میں بھی وہی خلوص وہی محبت جو کہ آپ کی شخصیت کا لازمہ تھی۔ مجھے ان چند لمحوں کی ملاقات سے بھی بے پناہ خوشی ہوئی کیونکہ جب میں چنیوٹ سے کانفرنس میں شرکت کے لئے چلا تھا تو جہاں پر مجھے کانفرنس میں شمولیت کی خوشی تھی وہیں اس سے بھی بڑھ کر خوشی اس بات کی بھی تھی کہ حضرت شاہ جی سے ملاقات ہو گی۔

دوسرے روز قومی اخبارات میں مجلس احرار اسلام کا اہم سیاسی فیصلہ شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوا۔ پورے ملک میں اس فیصلے کو بنظر استحسان دیکھا گیا۔ اخبارات نے اس پر اداریے لکھ کر اسے قومی استحکام اور ملکی فلاح و بہبود کے لئے نیک فال قرار دیا۔ مجلس احرار اسلام نے اس فیصلہ کے بعد رد قادیانیت کے کام کو مزید تیز کر دیا۔ احرار سیاسی امور میں مسلم لیگ کے ہمنوا تو ہو گئے لیکن وہ قادیانیت کے بارے میں مسلم لیگ کی حکمت عملیوں کے صریحاً خلاف بھی تھے۔ جس سے اس بات کا خدشہ موجود تھا کہ یہ اتحاد کہیں عارضی

ثابت نہ ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب ملک کے اندر ضمنی انتخاب کا مرحلہ آیا تو مسلم لیگ نے احرار کی درخواست کو مسترد کرتے ہوئے بعض قادیانیوں کو بھی مسلم لیگ کے ٹکٹ دیئے۔ جس پر احرار نے سخت ردعمل کا اظہار کیا۔ اور اعلان کر دیا کہ وہ قادیانی امیدواروں کی مخالفت کرے گی خواہ ان کے پاس مسلم لیگ کا ہی ٹکٹ کیوں نہ ٹکٹ ہو۔ ہر اس قادیانی کی مخالفت ہو گی جو الیکشن میں مسلمانوں کے نمائندہ بن کر اسمبلی کا ممبر بننے کی کوشش کرے گا چنانچہ احرار اسلام نے چک جمرہ کے حلقے سے بھی ایک قادیانی امیدوار عصمت اللہ کی مخالفت کا اعلان کر دیا اس کے علاوہ کئی دوسرے حلقوں میں بھی قادیانی امیدوار کھڑے کئے گئے۔ ہر جگہ ہر قادیانی کے مقابلے میں احرار ڈٹ گئے اور انہیں ناکام بنانے کے لئے کوششیں شروع کر دی گئیں۔ چک جمرہ کے حلقے میں قادیانی امیدوار کے خلاف وسیع پیمانے پر عوامی جلسوں کا اہتمام کیا گیا جن میں سے کئی جلسوں کو امیر شریعت نے بھی خطاب فرمانا تھا۔ شاہ جی نے ریل گاڑی کے ذریعے فیصل آباد ریلوے سٹیشن پر اترنا تھا۔ احسانوں کا جم غفیر آپ کے استقبال کے لئے وہاں پر موجود تھا۔ استقبال کرنے والے خوش نصیبوں میں میں بھی تھا۔ جب آپ کی گاڑی ریلوے سٹیشن پر آکر رکی تو فضا نعرۂ تکبیر کی صداؤں سے گونج اٹھی۔ امیر شریعت زندہ باد کے نعروں سے ماحول تھرا گیا۔ گاڑی کے جس ڈبے میں امیر شریعت موجود تھے اس کے ساتھ والے ڈبے میں علاقے کے بہت بڑے پیر جو مولوی قطبی کے نام سے معروف تھے بھی موجود تھے۔ انہیں بھی کسی کام کے سلسلے میں فیصل آباد میں ہی اترنا تھا۔ ان کی نگاہ جب امیر شریعت پر پڑی تو انہوں نے ازراہ احترام شاہ جی سے فرمائش کرتے ہوئے کہا کہ حضرت آپ کا بستر میں اٹھا لیتا ہوں۔ شاہ جی (جو غالباً انہیں پہلے سے ہی جانتے تھے) نے جواب میں فرمایا کہ یہ بوجھ تو میں اکیلا بھی اٹھا لوں گا تم اس بوجھ میں میرا ہاتھ بٹاؤ جو رد قادیانیت کے سلسلے میں مجھ پہ آن پڑا ہے آؤ میرے ساتھ ملکر قادیانی امیدوار کے خلاف تقریریں کرو اور اسے ناکام بنانے میں میرا ساتھ دو سنا ہے اس علاقے میں تمہارے مریدوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ انہیں منع کرو کہ قادیانی امیدوار کو ووٹ نہ دیں تاکہ قادیانیوں کا یہ دعوی غلط ثابت ہو کہ وہ مسلمان ہیں اور مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت میں ان کے ووٹوں کے ذریعے اسمبلی کے رکن ہیں۔ چنانچہ پیر قطبی نے حامی بھر لی اور دوسرے روز ہم نے دیکھا کہ جلسہ گاہ میں وہ بھی موجود تھے۔ یہ خوبی تو حضرت شاہ جی میں بدرجہ اتم موجود تھی کہ وہ راہ جاتے ایک فرد کو اپنے ساتھ ملا لیتے تھے اور اس سے دین کی خدمت کا کام لیتے تھے۔ چنانچہ یہ انتخابی معرکہ آج تک لوگوں کو یاد ہے، میں خود روزانہ سائیکل پہ سوار ہو کر علاقے کے اندر ہمیشہ جلسوں میں احرار رضاکاروں کے ساتھ شریک ہو کر لوگوں کے جذبۂ ایمانی سے اپنے ایمان کو تازہ کرتا۔ مسلمانوں کا جذبہ ان کا ولولہ اور جوش و خروش دیدنی تھا۔ شاہ جی پر نچھاور ہوتے جاتے اور کہتے کہ انشاء اللہ ہم اس قادیانی کو مسلمانوں کا نمائندہ نہیں بننے دیں گے۔ مجھے یاد ہے کہ چک جمرہ کے ریلوے سٹیشن پر قادیانیوں اور احرار رضاکاروں کے درمیان ایک زبردست لڑائی بھی ہوئی تھی۔ جس میں قادیانی امیدوار عصمت اللہ خود بھی زخمی ہوا تھا۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا یہ امرور
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

اسی انتخابی معرکہ کے دوران اس وقت کے وزیر اعظم خان لیاقت علی خان لائل پور ریلوے سٹیشن پر ایک سپیشل سیلون کے ذریعے پہنچے ان کے پروگرام میں قادیانی، مسلم لیگی امیدوار کے حق میں تقریر کرنا تھی۔ اس پروگرام پر علاقے کے مسلمان اچھے خاصے مشتعل تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ لیاقت علی خان عصمت اللہ کے حق میں انتخابی تقریر کریں۔ لیکن احراری حلقے اس بات پر متفکر بھی تھے کہ اگر لیاقت علی یہ تقریر کر گئے تو الیکشن میں ہمارے خلاف ایک غلط تاثر قائم ہو گا۔ اور شاید قادیانی امیدوار جیت بھی جائے اس طرح امیر شریعت کی اس تحریک کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ادھر احراری حلقے اس سوچ میں تھے اور ادھر قدرت کاملہ بھی اپنا کام کر رہی تھی۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی کہ انہوں نے ریلوے سٹیشن پر خان لیاقت علی خان کے ساتھ علیحدگی میں ملاقات کی۔ تاکہ وزیر اعظم کو قادیانیت کے خدوخال سے آگاہ کر کے انہیں جلسے میں خطاب سے باز رکھیں چنانچہ اس کوشش میں وہ کامیاب ہو گئے۔ دس منٹ کی ملاقات تقریباً ایک گھنٹے کی ملاقات میں تبدیل ہو گئی، قاضی صاحب نے اتنی خوبصورتی کے ساتھ قادیانیت کا تار و پود ان کے سامنے بکھیرا کہ وہ اس بات پر متفق ہو گئے اور تقریر کئے بغیر واپس چلے گئے خان لیاقت علی خان نے قاضی صاحب سے وعدہ کیا کہ وہ نہ صرف اس حلقے میں بلکہ ملک بھر میں کسی قادیانی امیدوار کے حلقے میں نہیں کریں گے۔ انہیں قادیانیت اور اسکی درپردہ سازشوں سے واقفیت ہو چکی تھی ان دونوں رہنماؤں کے درمیان کچھ ایسے وعدے بھی ہوئے جو مستقل قریب میں قادیانیت کے لئے نقصان دہ ہو سکتے تھے۔ اس بات کا علم جب قادیانیوں کو ہوا تو وہ پھر خبردار ہو گئے یہی وجہ ہے کہ قادیانی اس سازش میں برابر کے شریک تھے جو لیاقت علی خان کو شہید کرنے کے لئے کی گئی تھی۔ اگر اس مقدمہ شہادت میں دیانتداری سے کام لیا جاتا اور مقدمہ کی ساری فائل کو ضائع نہ کیا جاتا تو قادیانی سازش اسی وقت ہی طشت از بام ہو جاتی۔ بہر حال وزیر اعظم خان لیاقت علی خان کے واپس چلے جانے سے قادیانی حلقے پر اوس پڑ گئی اور وہ بری طرح مایوس ہو گئے۔ انتخاب کے نتائج کا جب اعلان ہوا تو پورے ملک کے اندر ایک قادیانی بھی منتخب نہ ہو سکا۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کا کرم اور امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی قیادت میں مجلس احرار اسلام کا پاکستان میں قادیانی اور قادیانی نواز حکمرانوں کے خلاف پہلا کارنامہ تھا جس پر ملت اسلامیہ امیر شریعت کی ممنون ہے۔

چنانچہ اس عظیم کارنامے پر لاہور کے اندر مجلس احرار اسلام پاکستان کی جانب سے یوم تشکر منایا گیا۔ یوم تشکر کی اس تقریب میں میں بھی شامل تھا۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اپنی تقریر کے دوران خداوند تعالیٰ کے شکر ادا کرتے ہوئے قادیانیوں کی عبرتناک شکست کو مسلمانوں کی ایک عظیم فتح قرار دیا۔ دہلی دروازے کے باہر احرار کا یہ عظیم الشان اجتماع مسلمانوں کے جوش و خروش کی عکاسی کر رہا تھا۔ ان کے

چہروں پر خوشی کے آثار ہویدا تھے۔ انہیں مجلس احرار اسلام کی اس تحریک کی اہمیت کا اب شدت کے ساتھ احساس ہو چکا تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی یہ عظیم فتح قادیانی مذموم مقاصد پر ضرب کاری ہے جس کا سارا "کریڈٹ" سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی ذات کو جاتا ہے۔ شاہ جی نے فرمایا جب تک میری زندگی ہے اس فرقۂ ضالہ کی مخالفت کرتا رہوں گا۔ اور اسے کیفر کردار تک پہنچا کر ہی دم لوں گا۔

ہائے وہ بھی کیا سماں تھا، جسے آج بھی چشم تصور سے دیکھتا ہوں تو دل بلیوں اچھلنے لگتا ہے۔ ایک عجیب قسم کی کیفیت محسوس کرتا ہوں۔ امیر شریعت سٹیج پر فروکش ہیں اور ان کا نورانی چہرہ تمتما رہا ہے۔ سامنے لاکھوں کا مجمع، ارد گرد سرخ وردیوں میں ملبوس ہزاروں کی تعداد میں احرار کے بہادر، مخلص، انتھک رضاکار ہر پانچ منٹ کے بعد نعروں کی گرزا دینے والی آواز گونجتی ہے۔

قادیانی ہیں علیحدہ ملت اسلام سے
اس میں شامل ہے تیری کاوش مثال آفتاب
دہر سے تھا مختلف آواز کا جادو تیرا
تیرے لب پہ دیدنی تھی زینت ام الکتاب

اسی جلسے میں مولانا ظفر علی خان ضعیف العمری کے باوجود امیر شریعت کو اس عظیم کامیابی پر مبارک باد دینے کے لئے بہ نفس نفیس تشریف لائے ان کے جسم پر اور کپکپی طاری تھی۔ لیکن قادیانیوں کے خلاف ان کے جذبات اب بھی جوان نظر آتے تھے۔ ان کی جلسہ گاہ میں آمد پر ایک عجیب سماں تھا۔ کیف و سرور، جوش و جذبہ سے فضا معمور نظر آتی تھی۔ ان دو بزرگ رہنماؤں کو ایک مدت کے بعد اکٹھا دیکھ کر کئی لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ شاہ جی نے سٹیج پر اپنے مخصوص انداز میں مولانا ظفر علی خان کا استقبال کیا اپنے دونوں ہاتھوں میں مولانا کے رخسار لیکر انہیں خوش آمدید کہا اور عقیدت و احترام کے ساتھ اپنے پاس بٹھایا۔ اور پھر مصروف گفتگو ہو گئے۔ جب میں یہ پرانی یادیں سمیٹ رہا ہوں تو مولانا ظفر علی خان کا قادیانیوں کے خلاف صحافت کے میدان میں ایک طویل جہاد نظروں کے سامنے ابھر کر آجاتا ہے۔ روزنامہ زمیندار پوری قوت کے ساتھ قادنیت کا محاسبہ کر رہا ہے۔ مولانا کی نظموں کا ایک لامتناہی سلسلہ۔ کیا خوب اور کیا نرالا انداز تھا۔ دو شعر ملاحظہ فرمائیں۔

سنا ہے قادیاں میں بانسری بجتی ہے گوکل کی
مگر یہ بانسری والا کنہیا ہو نہیں سکتا
غلام احمد کو کیا نسبت مجدد الف ثانی سے
شریٰ جتنا بھی بڑھ جائے ثریا ہو نہیں سکتا

میں دیر تک شاہ جی پاس بیٹھا رہا انکی باتیں سنتا رہا۔ بلکہ دل پر نقش کرتا رہا میں نے زندگی میں ان کی باتوں

سے ہی رہنمائی حاصل کی ہے۔ اس کے بعد بھی مختلف اوقات میں ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور تعلق خاطر کا یہ رشتہ وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا رہا۔ ہم لوگ چنیوٹ سے لائل پور (فیصل آباد) آ گئے۔ جب بھی آپ لائل پور تشریف لاتے میں سب کچھ چھوڑ کر آپ کے پاس پہنچ جاتا۔ گورونانک پورہ کے مدرسہ اشرف المدارس کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لئے آپ ضرور تشریف لاتے تھے۔ فیصل آباد کا یہ مشہور دینی مدرسہ تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ اس جلسہ کے موقع پر تشریف لائے تو دھوبی گھاٹ گراؤنڈ میں آپ کی تقریر کا اہتمام تھا۔ تقریر کے دوران بڑے زوروں سے آندھی آئی۔ شامیانے اڑاڑ جاتے تھے۔ لوگ بانس پکڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ تقریر جاری تھی۔ کہ آندھی کے بعد بارش شروع ہو گئی بارش بھی بے تحاشہ تھی چند منٹوں میں گراؤنڈ پانی سے بھر گیا۔ شاہ جی نے تقریر ختم کرنے کا اعلان کیا تو لوگوں نے پرزور انداز میں تقریر جاری رکھنے کا مطالبہ کیا۔ کہ حضرت تقریر جاری رہے ہم پانی میں بیٹھ کر بھی تقریر سنیں گے۔ شاہ جی نے چند منٹ تقریر جاری رکھنے کے بعد اس وعدہ پر جلسہ کے اختتام کا اعلان کیا کہ کل پھر اس جگہ جلسہ ہو گا۔ لوگوں نے اس وعدہ پر جلسہ کے خاتمے پر اتفاق کیا۔

غالباً ۱۹۵۵ء کی بات ہے جب میں گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں زیر تعلیم تھا۔ کالج کی ہاکی ٹیم کے ہمراہ ملتان جانا ہوا۔ ملتان میں ہمارا قیام کالج کے ہوسٹل میں تھا۔ جہاں چند قدموں کے فاصلے پر حضرت شاہ جی کی رہائش گاہ تھی۔ آپ سے ملاقات کا شوق بے چین کئے ہوئے تھا۔ چند دوستوں کے ساتھ شاہ جی کے پاس حاضر ہو گیا۔ دروازے پر دستک دی تو اندر سے شاہ جی کی ہی آواز آئی آ جائیے۔ چنانچہ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اندر بیٹھک میں داخل ہو گیا۔ آپ زمین پر تشریف فرما تھے۔ چند افراد بیٹھے تھے۔ یہ غالباً ان دنوں کی بات ہے جب آپ پر فالج کا پہلا حملہ ہو چکا تھا۔ کمزوری کے علاوہ گفتگو میں فالج کا اثر نمایاں تھا۔ لیکن چہرہ ویسے ہی شگفتہ اور طبیعت پر کوئی ملال نہ تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے یہ میرا بیٹا کہاں سے آ گیا ہے۔ میں نے جواباً عرض کیا کہ آپ کے ملتان والوں سے ہاکی میچ کھیلنے آیا ہوں۔ فوراً سرائیکی زبان کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ اچھا توں ہن "اساں ملتانیاں کوں ہراون آ گئیں۔ اینویں نہ تھیسی" ("اچھا تو اب تم ہم ملتانیوں کو ہرانے کے لئے آ گئے ایسا نہیں ہو گا") جس کے بعد دوسری باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے طبیعت کا پوچھا فرمانے لگے بھئی طبیعت کا کیا پوچھتے ہو بس میں تمہارے سامنے موجود ہوں دیکھ لو۔ اب میرا جسم میرے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو چکا ہے۔ میرے ہاتھ، پاؤں، دل، دماغ، آنکھیں، زبان غرضیکہ جسم کا ایک ایک عضو میری رعایا ہے اور میں اس کا حاکم۔ میں نے اپنی رعایا سے زیادہ کام لیا۔ اتنا زیادہ کہ ان کا بھرکس نکال دیا ہے۔ کیا اب انہوں نے میرے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا ہے۔ چند روز پہلے فالج کا حملہ ہوا تو سمجھ گیا کہ یہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بڑا مضبوط جسم لیکن میں نے ستر برسوں میں اسے دین پر قربان کر دیا۔ اب اس میں جسم کا کیا قصور ہے۔ بہر حال میں الحمدللہ! اس وقت تمہارے سامنے بیٹھا باتیں کر رہا ہوں۔

شکر ہے اللہ کا جس حال میں رکھے۔ میں خوش ہوں اس کی خوشی میں، اس طرح وقت گزرتا رہا۔ اور ہم باتوں میں مصروف رہے۔ بالآخر میں نے اجازت طلب کی۔ آپ نے مجھے دعاؤں سے رخصت کیا۔ باہر آکر میں نے اپنے دوستوں سے پہلی بات یہی کی کہ یار یہ اچھی بات نہیں ہوئی شاہ جی نے ہمیں ہماری شکست کی پیشگی خبر دے دی ہے۔ چنانچہ دوسرے روز جب ہمارا میچ ہوا تو ہم واقعی ملتانیوں سے میچ ہار گئے۔

۱۹۵۷ء سے ۱۹۵۹ء تک میں ایم اے کے سلسلے میں لاہور مقیم رہا۔ ان دو برسوں میں دو دفعہ اسیر ان سے ملاقات ہوئی۔ پہلی ملاقات جیل روڈ پر صوفی عبدالحمید کی کوٹھی پر اور دوسری لاہور ریلوے سٹیشن پر۔ صوفی عبدالحمید کی کوٹھی پر تو آپ سے اس وقت ملاقات ہوئی جب وہاں شاہ جی کے مرشد حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری قیام پزیر تھے اور شاہ جی ان سے ملنے کے لئے تشریف لائے تھے۔ انہی دنوں مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات ہوئی۔ میں ۴ مزنگ روڈ پر خضر تیمی ایڈووکیٹ کے دفتر پر قیام پذیر تھا وہ میرے والد محترم کے دیرینہ دوست تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات پر شہر میں منادی بھی ہوئی اور اخبار میں ایک اشتہار بھی چھپا کہ مولانا داؤد غزنوی موچی دروازے کے باہر آپ کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائیں گے چنانچہ میں اپنے ایک ساتھی ممتاز سہارن کے ساتھ مزنگ روڈ سے پیدل چل کر موچی دروازے پہنچا۔ جنازے سے فارغ ہی ہوا تھا۔ کہ کسی جاننے والے نے بتایا کہ حضرت شاہ جی شملہ پہاڑی کے قریب حاجی عبدالمتین صاحب کے ہاں قیام پذیر ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنے ساتھی ممتاز سہارن سے ان کے پروگرام کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بھی شاہ جی سے ملنے کا کہا تو ہم دونوں وہاں سے پیدل حاجی عبدالمتین کی کوٹھی پر پہنچے۔ لیکن وہاں سے ہمیں پتہ چلا کہ شاہ جی صوفی عبدالحمید کی کوٹھی جیل روڈ پر اپنے پیرومرشد کے ساتھ قیام پذیر ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں شملہ پہاڑی سے جیل روڈ پر صوفی صاحب کی کوٹھی پر پہنچے تو حضرت شاہ جی کوٹھی کے مشرقی لان میں اپنے عقیدت مندوں کے درمیان تشریف فرما تھے۔ جبکہ کوٹھی کے اندر ایک وسیع کمرے میں حضرت عبدالقادر رائے پوری کی محفل تھی۔ حضرت شاہ جی کو میں نے سلام عرض کیا اور کہا کہ حضرت آج تو آپ کے لئے بہت پیدل چلا ہوں۔ آپ سے ملاقات کا اشتیاق تھا شکر ہے کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔ پھر میں نے اپنے سفر کی کہانی بھی کہہ ڈالی جواب میں فرمانے لگے۔ تو کیا یہ تیرا مجھ پر کوئی احسان ہے۔ اپنے بیٹے ہو ملنے کے لئے آئے ہو۔ آؤ بیٹھو۔ میری طرف بھی تو دیکھو اس عمر میں تین منزلہ ہسپتال میں اوپر گیا اور دانت لگوا کر آرہا ہوں۔ میں وہیں آپ کے پاس بیٹھ گیا اور تذکرہ جاری تھا مولانا ابوالکلام آزاد کا۔ زبان امیر شریعت کی بات ابوالکلام کی۔ مولانا ابوالکلام کا کردار، آپ کا علم و فضل شاہ جی کی زبان سے بیان ہو رہا تھا اور وہاں پر موجود تمام لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ فرمانے لگے۔

یہ حکومت ہندوستان کا مولانا ابوالکلام پر احسان تھا کہ انہوں نے مولانا کو وزیر اعظم بنایا ہوا تھا۔ بھائی یہ تو مولانا ابوالکلام آزاد کا ہندوستان کی حکومت پر احسان تھا کہ وہ ان کے وزیر تعلیم تھے۔ میری تمام زندگی پڑھے لکھے لوگوں میں بسر ہوئی ہے ایسا عالم فاضل شخص شاید ہی کوئی اور میری نظروں سے گزرا ہو۔ عربی

جنکی مادری زبان ہو، اردو جس کے ہاتھ کی چھڑی اور فارسی جس کے گھر کا پانی بھرتی ہو اور انگریزی بھی ایسی خوب جانتے تھے (مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا) کہ بابو اتنی اچھی انگریزی تم بھی کیا جانو، وہ ہمارے دور کے واقعی امام ابن تیمیہ تھے۔ کیا کیا خوبیاں تھیں جو خدا نے ان کے دل و دماغ میں سمادی تھیں۔

اب بڑی اچھی باتیں ہو رہی تھیں۔ شاہ جی ابوالکلام آزاد کی شخصیت و کردار پر اپنے مخصوص انداز میں ابھی باتیں کر ہی رہے تھے۔ کہ ایک آدمی نے آپ سے کہا کہ حضرت رائے پوری آپ کو اندر کمرے میں یاد فرما رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت شاہ جی فوراً کھڑے ہو گئے آپ پر یکسر ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہو گئی۔ چہرے کا رنگ بدل گیا سرخی کی بجائے اب چہرے پر زردی کے آثار ہویدا تھے۔ متانت اور سنجیدگی پہلے سے وافر تھی۔ پہلے ننگے سر بیٹھے تھے اندر جانے کے لئے باقاعدہ سر پر رومال باندھا اور اس طرح عجز و انکسار کی تصویر بنے ایک سعادت مند مرید ایک باکمال پیر کی بارگاہ میں حاضری کے لئے ہم سے جدا ہو گیا۔ ہم آپ کے پیچھے پیچھے کمرے کے دروازے تک تو آئے۔ اندر تو جانے کی گنجائش نہیں تھی۔ کمرہ پہلے ہی کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہاں دروازے سے حضرت رائے پوری کی زیارت نصیب ہوئی۔ یہ پہلی اور آخری زیارت تھی جو مجھے نصیب ہوئی۔ اس کے بعد حضرت رائے پوری کو کبھی نہ دیکھ سکا البتہ ان کے جنازے میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی یہ جنازہ خالصہ کالج لائل پور کی وسیع گراؤنڈ میں ہی ہوا تھا۔ کمرے کے اندر ایک جانب کونے میں حضرت رائے پوری پلنگ پر اکیلے میں تشریف فرما تھے۔ انتہائی کمزور اور نحیف و نزار جیسے ہڈیوں کی ایک چھوٹی سی ڈھیری کسی نے بستر پر رکھ دی ہو۔ شاہ جی چپکے سے اندر داخل ہوئے۔ سلام کیا اور چارپائی کے ایک طرف چپکے سے بیٹھنے لگے تو حضرت رائے پوری نے ارشاد فرمایا کہ نہیں شاہ جی یہاں میرے پاس چارپائی پر تشریف رکھیں ان لوگوں کو کچھ وعظ کریں حضرت شاہ جی نے اپنے پیر و مرشد کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے وعظ کرنا شروع کر دیا دیر تک ہم بھی دروازے باہر کھڑے شاہ جی کی باتوں سے مستفیض ہوتے رہے۔ جس کے بعد ہم وہاں سے روانہ ہوئے ہمیں دیر ہو رہی تھی۔ اور پھر پیدل ہی اپنی منزلِ مقصود ۴ فرنگ روڈ پر پہنچنا تھا۔

غالباً ۱۹۵۸ء کا سن تھا۔ ڈاکٹر خان صاحب مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ تھے جنہوں نے مجلس احرار اسلام سے پابندی اٹھا دی۔ یہ پابندی ۱۹۵۳ء میں تحریک تحفظ ختم نبوت کے دوران لگائی گئی تھی۔ پابندی اٹھتے ہی بہت جلد شاہ جی کے حکم پر مجلس احرار اسلام نے جماعت کی تنظیم نو کے ضمن میں لاہور میں مولانا داؤد غزنوی کے مدرسہ میں احرار کنونشن طلب کیا تھا اس وقت میں ایم اے فائنل کا سٹوڈنٹ تھا اور کنونشن میں شریک تھا۔ ملک بھر سے سرخ قمیضوں میں ملبوس ماسٹر تاج الدین انصاری اور شیخ حسام الدین بھی کنونشن میں شریک تھے۔ رضا کاروں اور رہنماؤں کے چہرے پر خوشی کے آثار تھے کہ قافلۂ اہل جنون پھر سوئے منزل روانہ ہونے والا ہے۔ نیا ولولہ، نیا جذبہ عجیب ترنگ، انوکھی امنگ دیکھائی دے رہی تھی۔ قبیلۂ احرار ایک

مرتبہ پھر صفوں کو درست کر کے میدان کار زار میں کودنے کے لئے بے تاب تھا۔ وہی ولولہ، جنہیں دیکھ کر نظیری کا وہ شعر یاد آگیا جو شاید نظیری نے احرار کے لئے ہی کہا تھا کہ اس دور میں انہی پر منطبق ہوتا ہے۔

گریزد از صف ماہر آنکہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

کنونشن میں محترم شیخ حسام الدین کو چیف آرگنائزر کے طور پر منتخب کیا گیا۔ تاکہ وہ پاکستان بھر میں مجلس احرار اسلام کو دوبارہ منظم کریں اسی کنونشن کے خاتمے پر ایک اعلان کے ذریعے احرار رضا کاروں کو مطلع کیا گیا کہ امیر شریعت ملتان سے ایک ٹرین کے ذریعے رات کو لاہور پہنچ رہے ہیں۔ لہذا تمام احرار رضا کار حضرت شاہ جی کے استقبال کے لئے گاڑھی سے پہلے پلیٹ فارم پر پہنچ جائیں۔ اعلان میں نے بھی سنا، خوشی ہوئی کہ شاہ جی کی زیارت کا ایک اور موقع مل رہا ہے۔ چنانچہ پلیٹ فارم پر استقبال کے لئے پہنچ گیا۔ پہ ہر طرف سرخ پوش پھیلے ہوئے تھے۔ عزم و ہمت کے نشان جب بھی نعرہ زن ہوتے تو در و دیوار گونج اٹھتے۔ ایک عجیب سماں تھا۔ امیر شریعت زندہ باد کے نعروں سے فضاء میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ایک جم غفر، فقیر کے استقبال کو بے تاب ہوا جاتا تھا۔ اسی سوچ میں مستغرق تھا کہ شاہ جی کی گاڑی پلیٹ فارم پر آتی دیکھائی دی۔ اب اتفاق ہے کہ شاہ جی کا ڈبہ وہیں آکر رکا جہاں میں کھڑا تھا میں سب سے پہلے اندر داخل ہوا اور سب سے پہلے آپ سے ملا۔ شاہ جی نے نظر میں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور فرمایا بیٹا یہ میرا سامان ہے میں نے وہ سامان اٹھایا اور باقی کچھ دوسرے رضا کاروں نے ہم ڈبے سے پلیٹ فارم پر حضرت شاہ جی کے جلو میں باہر آئے ہر طرف سر ہی سر تھے تِل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے شاہ جی کے لئے راستہ بنا۔ لوگ باری باری آپ سے ملتے جاتے اور آپ آہستہ آہستہ آگے بڑھتے جاتے تھے۔ اس بار شاہ جی پر خاموشی کا غلبہ تھا۔ بے نیازی اسقدر کہ مجال ہے کہ آنکھ اٹھا کر بھی پورے استقبال کو کمزوری بھی پہلے سے زیادہ تھی۔ شگفتگی پر سنجیدگی اور متانت کا غلبہ تھا۔ میں تو جیسے شاہ جی کے ساتھ نتھی ہو چکا تھا۔ آہستہ آہستہ مجمع کے ساتھ پل عبور کر کے باہر ڈیوڑھی میں آئے تو آگے ایک کار کھڑی تھی جس پر آپ نے سامان رکھ دیا اور آپ اپنے پیر و مرشد کی قیام گاہ صوفی عبدالحمید کی کوٹھی کے لئے روانہ ہوگئے۔ میں بھی دوسرے رضا کاروں کے ساتھ شاہ جی کی کار کو دور تک جاتے دیکھتا رہا۔ اور سوچتا رہا کہ اب شاہ جی کسی اور کیفیت میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ اور ہم انہی محفلوں سے شاید اس طرح لطف اندوز نہ ہو سکیں گے۔ جیسے عمر بھر ہوتے رہے ہیں اور اسی سوچ کے دوران آپ کی کار میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

یہ میری آپ سے آخری ملاقات ہے۔ مقام ملاقات جامع مسجد فیصل آباد میں اپنے سب سے بڑے فرزند مولانا سید ابوسعاویہ ابوذری کے نکاح کے موقع پر آپ یہاں تشریف لائے۔ میں اپنے چھوٹے بھائی باقر صغیر احمد کے ہمراہ مسجد میں پہنچا تو آپ مسجد کے شمالی حصہ میں تشریف فرما تھے۔ ذرا قریب ہوئے تو سنا کہ کسی سے کہہ رہے تھے کہ بھائی ذرا میرے لئے پینے کا پانی مٹی کے اس برتن میں لے آؤ لتنے میں ہم دونوں پر

نظر پڑ گئی تو اسے کہا رہنے دو میرے اپنے بیٹے آ گئے ہیں۔ یہ فقرہ خلوص اور محبت میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ آج بھی اس کی حلاوت سے دل و دماغ معطر ہو جاتے ہیں۔ میرے اپنے بیٹے آ گئے۔ چھوٹا بھائی صغیر جلدی جلدی پانی لینے چلا گیا اور میں شاہ جی کے پاس بیٹھ کر ان سے ہمکلام ہوا۔ شاہ جی آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ جواب میں فرمایا۔ جاؤ میں تم سے کلام نہیں کرتا۔ تم تو بڑے نالائق بیٹے ہو۔ میری یہ حالت ہو رہی ہے تم نے کبھی ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر پتہ کیا ہے کہ تیرے ابا کا کیا حال ہے۔ پس یہ فقرہ آپ نے کہا کہ مجھ پر جیسے بجلی کوند گئی۔ پاؤں تلے سے زمین نکل گئی معاً خیال آیا کہ شاہ جی تو میرے خط کا انتظار کرتے رہے ہیں اور یہاں میرے تصور میں بھی نہیں ہے کہ انہیں خط لکھ کر حال پوچھوں کہ ان کے اور میرے درمیان اگرچہ ایک تعلق تو ہے ہی لیکن مقام و مرتبے کا اتنا فرق ہے کہ اس فرق کی موجودگی میں میں اسے ایک جسارت ہی خیال کرتا رہا وہ میرے خط کا انتظار کریں۔ اللہ اللہ کتنا بڑا انسان کتنی بڑی خوبیوں کا مالک جس میں سب سے بڑی خوبی انسانوں سے محبت کرنا ہے۔ بہر حال معذرت کی معافی مانگی اور انہوں نے معاف کر دیا۔

شاہ جی دعا کے لئے مائیک پر تشریف لائے۔ آپ ابھی مائیک پر آئے ہی تھے کہ لوگوں نے تقریر کا تقاضہ شروع کر دیا۔ بظاہر تو یہ مطالبہ درست تھا۔ لیکن اب شاہ جی کچھ بے نیاز سے تھے۔ تقریروں کا شوق و ذوق وقت کے ساتھ ساتھ ان کی طرح جیسے بوڑھا ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب تقاضہ تقریر بڑھا تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

"بس بھائی بہت ہو چکی تقریریں۔ اب دل میں کوئی حسرت باقی نہیں ہے۔ میں تو اپنے بیٹے کے نکاح کے سلسلے میں آپ کے شہر میں موجود ہوں۔ بس دعا کریں۔ ہمارے دو خاندانوں کے درمیان یہ نکاح باعث خیر و برکت ثابت ہو اور یہ معاملہ بخیر و خوبی انجام پائے۔ اسی دوران لوگوں نے دوبارہ تقریر کی فرمائش کی تو آپ نے کہا۔ تقریر تو نہیں لیکن اب بھی ایک ترنگ اور امنگ سی دل میں ضرور پیدا ہوتی ہے کہ خدا مجھے توفیق دے تو میں اپنے یار ناصر (صدر ناصر کی طرف اشارہ تھا) کے قصیدے بیان کروں کہ اس نے کس طرح سے انگریزوں کو جوتے مار مار کے سویز سے نکالا ہے۔"

یہ آپ کی زندگی کی مختصر ترین تقریر تھیں جو اس روز آپ نے کی تھی۔ بظاہر تو یہ ایک فقرے میں ختم ہو گئی۔ لیکن اس ایک فقرے میں بھی انگریزوں کے خلاف بلا کی نفرت جھلک رہی تھی سویز نہر کا بحران اور مصر کا انقلاب آپ کے سامنے تھا۔ جس ہزیمت کا سامنا انگریزوں کو اس بحران میں اٹھانا پڑا اس کی طرف ہی آپ کا اشارا تھا۔ چنانچہ نکاح کے بعد جب شاہ جی واپس جانے لگے تو میں آپ کا ہمراہ تھا مسجد کے شمالی جانب کا دروازہ تھا۔ سامنے گلی میں تاحد نظر لوگ ہی لوگ تھے۔ آپ رک گئے اور آپ نے مولانا ابوذر بخاری صاحب کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا۔

"حافظ جی دیکھ رہے ہو لوگوں کا اکٹھ یہ سب میرے پاس کیا لینے آجاتے ہیں۔ میں تو ایک فقیر ہوں دوسرے وقت کی روٹی پر بھی قادر نہیں ہوں۔ یہ لوگ انتہائی مخلص ہیں مجھ سے محبت

کرتے ہیں مجھ سے محبت لینے آجاتے ہیں میں نے بھی ان سے زندگی بھر محبت ہی کی ہے۔ یہ میرے خلوص کی کمائی ہیں لوگ مرنے سے پہلے جائیدادیں چھوڑ کر مرتے ہیں۔ میری جائیداد یہی لوگ ہیں جسے میں تمہارے سپرد کر کے جا رہا ہوں۔ واللہ باللہ میں نے جب بھی زندگی میں ان لوگوں کو دین کے تحفظ کے لئے پکارا یہ لوگ سروں پر کفن باندھ کر اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے میرے کہنے پر قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور سینے پر گولیاں کھا گئے۔ اگر تم نے بھی ان کے ساتھ مخلصانہ برتاؤ جاری رکھا تو دین کے لئے یہ تمہارے کام بھی آئیں گے ان شاء اللہ"

یہ وہ تاریخی چند فقرے ہیں جو تمام عمر کے تجربات کا نچوڑ ہیں۔ شاید زندگی بھر یہ محبت، یہ خلوص کا مظاہرہ بھی اسی لئے تھا۔ اس کے ذریعے لوگوں سے دین کے تحفظ اور ناموس رسالت کے لئے کام لینا چاہتے تھے۔ اور انہوں نے یہ کام لیا۔ وہ اس میں سو فیصد کامیاب و کامران تھے۔ اس کے بعد ایک بزرگ صورت غالباً جیترال ہاؤس والے بزرگ جن کی دکان مسجد کے قریب ہی تھی شاہ جی سے اصرار کر رہے تھے کہ شربت کے ایک گلاس کے لئے دکان پر تشریف لائیں۔ اور شاہ جی برابر معذرت کر رہے تھے۔ کہ وہ ذیابطیس کے مریض ہیں۔ پھر وہ ہم سے پیپلز کالونی کے لئے رخصت ہو گئے اس کے بعد پھر ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ۳۱ اگست ۱۹۶۱ء کی شام وہ ہم سب کو داغِ مفارقت دیکر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ لیکن وہ اب بھی دل و دماغ میں موجود ہیں۔ اور موجود رہیں گے۔

ہر گر ۔ میرو آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است برجریدہ عالم دوامِ ما۔

وہ سید کہ تھا صدر احرار ملت
جسے لوگ کہتے تھے شاہِ خطابت
یہ دنیا کہ مومن کا ہے قید خانہ
اسے چھوڑ کر رہ گیا سوئے جنت
ہوئی جنبو اختر واصفی کو
چو از بہر ارقام تاریخ رحلت
ندا آئی کیوں ہو نہ تاریک عالم
گیا مہر تاباں امیر شریعت
۱۹۶۱ء اختر واصفی